www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اکتوبر 2021

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

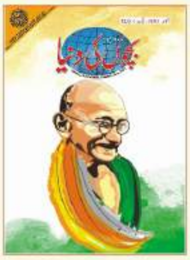

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زر تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC:CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 10 اکتوبر 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	ساجدہ زیدی کی شعری کائنات	ڈاکٹر مسرت	5
جہانِ نسواں	ممتاز شخصیت: ممتاز صدیقی	ڈاکٹر عنبر عابد	11
	منی بائی حجاب: کلکتے کی ایک مشہور طوائف شاعرہ	ڈاکٹر شاہد ساز	17
	تمل ناڈو میں اردو کے لوک گیت	عائشہ صدیقہ جے	23
	سرسید تحریک اور علی گڑھ	صبا نوشاد	27
	اردو رپورتاژ نگاری میں 'خواتین' کی حصے داری	عمران عاکف خان	32
	قائم چاند پوری: غالب کا پیش رو	مہر فاطمہ	38
	فضا ابن فیضی کی نظم 'خاتون اسلام کے نام' کا تجزیاتی مطالعہ	مصطفیٰ علی	42
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		45
افسانہ	زخمی احساس	ڈاکٹر خالدہ ناز	46
	نرگس آپا	صائقہ غیاث	49
حسن سخن	آشکارا خانم کشف، عارفہ افروز		52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	پیشہ ورانہ سرطان	مشکور احمد	56
آرائش و زیبائش			59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61

مشعل

ہندوستان کے سیاسی اور روحانی رہنما موہن داس کرم چند گاندھی آزادی کی تحریک کے اہم روح رواں تھے۔انھوں نے ستیہ اور اہنسا کا درس دیا۔انھوں نے ہندوستانی قوم کے حقوق کے لیے جدو جہد کی۔گاندھی جی نے ملک کی غربت کو ختم کرنے اور خواتین کے حقوق پر اصرار کیا۔مذہبی منافرت کو ختم کیا، چھوا چھوت کی مذمت کی اور معاشی خود انحصاری پر زور دیا۔سوراج کے لیے انتھک کوششیں کیں۔

گاندھی جی کی زندگی ہمارے لیے آدرش کی حیثیت رکھتی ہے۔اپنی تمام زندگی انھوں نے قوم کے لیے وقف کر دی۔ انھوں نے عدم تعاون کی تحریک کی قیادت کی۔برطانوی حکومت کے خلاف انقلاب کا بگل بجایا۔1942 میں انھوں نے بھارت چھوڑو شہری نافرمانی تحریک کا آغاز کیا اس کے لیے ان کو جنوبی افریقہ اور بھارت میں کئی سال قید کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔

عدم تشدد کے علمبردار مہاتما گاندی نے ہندوستانیوں کو سچ بولنے کی ترغیب دی۔گاندھی جی کی زندگی سچائی اور حق کے لیے ہی وقف تھی۔اگر چہ انھوں نے زندگی میں مختلف لڑائیاں لڑیں اور اس کے لیے مختلف قسم کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن وہ کبھی بھی اپنے عزائم سے پیچھے نہیں ہٹے۔کبھی اپنے اصولوں کی خلاف ورزی نہیں کی اور ہمیشہ اس پر قائم رہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں گاندھی جی کے افکار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔'تعلیم سب کے لیے' یہی گاندھی جی کا کہنا تھا۔گاندھی جی کے نزدیک آزاد ہندوستان کا مطلب خود کفیل اور خوشحال ہندوستان تھا۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ گھریلو صنعت اور زراعت کی صورت حال کو بہتر بنا کر ہندوستان سے غربت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

گاندھی جی نے ہمیشہ قوم کو صبر اور عزم و حوصلے کی تعلیم دی۔سچائی کا درس دیا۔ان کے صبر اور حوصلے کو دیکھتے ہوئے تمام ہندوستانی ان کے ساتھ ہو گئے اور ملک سے انگریزوں کے تسلط کا خاتمہ کیا۔ملک کی حفاظت اور اس کے تقدس کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے خواتین میں بھی انقلابی تبدیلی لانے کی کوشش کی۔خواتین کے تئیں ان کا نظریہ ہمدردانہ تھا۔وہ چاہتے تھے کہ ملک کی خواتین بھی بااختیار اور خود کفیل ہوں تا کہ وہ معاشرے میں اہم کردار ادا کر سکیں۔مختلف تحریکات میں گاندھی جی کے ساتھ خواتین بھی شامل رہیں۔انھوں نے خواتین سے جڑے اہم مسئلوں مثلاً جہیز کی لعنت، بیوہ کی دوبارہ شادی،، طلاق، خواتین کا احترام اور خواتین کی تعلیم پر بہت زور دیا۔گاندھی جی کی حیات اور تعلیمات آج بھی تر و تازہ ہیں۔ان پر عمل کر کے ہم اپنے ملک کو آگے لے جا سکتے ہیں۔

آپ کا

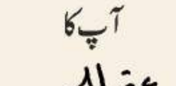

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ساجدہ زیدی کی شعری کائنات

ڈاکٹر مسرت

ساجدہ زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم سے وابستہ رہیں۔ان کی پہچان ایک شاعرہ اور تخلیق کار کے طور پر بھی قائم ہے۔ ساجدہ زیدی ایک ممتاز شاعرہ، فکشن نگار، ڈرامہ نویس اور تنقید نگار ہیں۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔سیل وجود، آتش سیال، آتش زیر پا اور جوئے نغمہ۔منظوم ڈراموں کا ایک مجموعہ اور طبع زاد ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔تنقید کے میدان میں بھی ساجدہ زیدی خاص شہرت رکھتی ہیں۔ان کے دو تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔علاوہ ازیں ایک ناول بھی منظر عام پر آیا۔

ساجدہ زیدی نے اپنی شاعری کا مواد اپنے اردگرد رونما ہونے والے حالات وحادثات سے لیا ہے۔ساجدہ زیدی کی شاعری میں انسانی درد و کرب، رشتوں کی پامالی کے احساسات کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی کے جذبے بھی ملتے ہیں۔ساجدہ زیدی کی شاعری کا ''میں'' ان کی شاعری کا اہم حصہ ہے۔یہ 'میں' ان کی ذات سے منسوب ہے۔ان کی نظم ''قرار جاں کہاں ہے'' ملاحظہ کیجئے:

دل وحشی یہ کہتا ہے قرار جاں کہاں ہے؟
کیا احساس کے ٹکڑے سمیٹوں...
کیا کسی بے نام
رشتے کا پتہ ڈھونڈوں؟
کتابوں کی گزرگاہوں میں کھو جاؤں...
کہ فکر و فلسفہ کی ر ریگزاروں میں نکل جاؤں؟
غموں کے رمز ڈھونڈوں...
یا...طرب کے جام چھلکاؤں
نشاطِ زیست کے اک جام میگوں میں بکھر جاؤں؟
کہ اس سیل روانِ وقت کی ہم رقص ہو جاؤں...

تلاش زیست میں اور جستجوئے حرف و معنی میں
ردائے نیلگوں کے پار جاؤں
رازِ ہستی کا پتہ ڈھونڈوں
جو روح عشق لرزاں ہے فضائے دیر میں اس میں سما جاؤں
رموزِ غم میں دل کا مدعا پاؤں
کہ اس دار فنا کے رمز پا جاؤں عدم کے بن میں کھو جاؤں
یہ دردِ ہجر...جو احساس کا تارِ گریباں ہے
اسے کس طرح سلجھاؤں؟

ساجدہ زیدی کی اس پوری نظم میں اپنی ذات کے تئیں حساسیت نمایاں ہے۔مذکورہ نظم میں اس انسان کی شکل واضح نظر آتی ہے جو تن تنہا اپنی زندگی کی آزمائشوں سے جنگ لڑ رہا ہے۔

انھوں نے اپنے احساسات کو جوں کا توں بیان نہیں کیا بلکہ اپنے تجربات واحساسات سے جو تاثرات ابھریں ان کو تخلیق کے پیکر میں ڈھالا۔شاعری احساس سے عبارت ہے اور اسی احساس کو انھوں نے فکر کے سانچے میں ڈھال کر اپنی نظموں میں ابھارا ہے۔زندگی کے تئیں ان کا رویہ منفرد ہے:

چلیں کوئی سمت ایسی ڈھونڈیں
کہ جس کے گہرے گھنے اندھیروں میں
کھو بھی جائیں
تو چشم بینا سے دیکھ پائیں
قدم بڑھائیں
تو گوشہ در گوشہ
کنج در کنج
ایسی مدہوش کن نئی رہگذاریں آئیں
جو ہر قدم کو سفر بنائیں

(مسرور راہیں)

ان کا ماننا ہے کہ ان کو تخلیقی ترغیب اپنے باطن کی آوازوں سے ملی۔انھوں نے ذاتی غموں کو کائناتی بنا کر پیش کیا۔انسانی المیوں اور نا انصافیوں سے وہ آنکھیں نہیں چرا پاتیں۔جھوٹ کی حکمرانی سے ان کو سخت نفرت ہے۔اقدار کی ناقدری پر ان کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ان تمام کیفیات کا ملا جلا احساس ان کی شاعری میں موجود ہے۔

ساجدہ زیدی اپنے شعور سے زندگی کی بے ثباتی کو پیش کرتی ہیں۔وہ صرف جذبات سے کام نہیں لیتیں بلکہ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔ان کی نظموں میں وجودیت کے فلسفے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔نظم 'کب سے محو سفر ہوں' دیکھیں:

ساجدہ!
کن یگوں کی مسافت سمیٹے ہوئے
اس بیاباں میں ہوں ہی بھٹکتی رہوگی
ان بگولوں کے ہمراہ یوں رقص کرتی رہوگی
کتنے صحراؤں میں آبلہ پائی کے نقش چھوڑے ہیں تم نے
کتنی بیدار راتوں سے مانگا ہے تم نے خراج تمنا
ساجدہ! کچھ کہو............
ہجر کے کن زمانوں میں اشکوں کی مالا پروئی
کن حسابوں چکایا ہے قرض جنوں
کون سے مرحلوں سے گزارا ہے
یہ اضطراب دل وجان وروح بدن
کس طرح جان سے گزرے ہیں طوفان غم.........
کس طرح تند آندھی کی یلغار میں

تم نے اپنی ردا کو سنبھالا
کیسے یخ بستہ تنہائیوں میں
جشن روح و دل و جاں منایا
شعلۂ آرزو میں کیسے حرف و نوا کو تپایا
جاگتی رات کی تیرگی کو
کس طرح مطلع نور یزداں بنایا
کتنے سجدوں سے اپنی جبیں کو سجایا..........؟

ساجدہ زیدی کا کمال یہ ہے کہ دکھوں اور غموں کی فراوانی اور شدت کے باجود ان کا لہجہ تلخ اور کاٹ دار نہیں ہوتا۔ زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے باوجود بھی وہ زندگی کو بوجھ نہیں سمجھتیں بلکہ پوری صداقت سے زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔

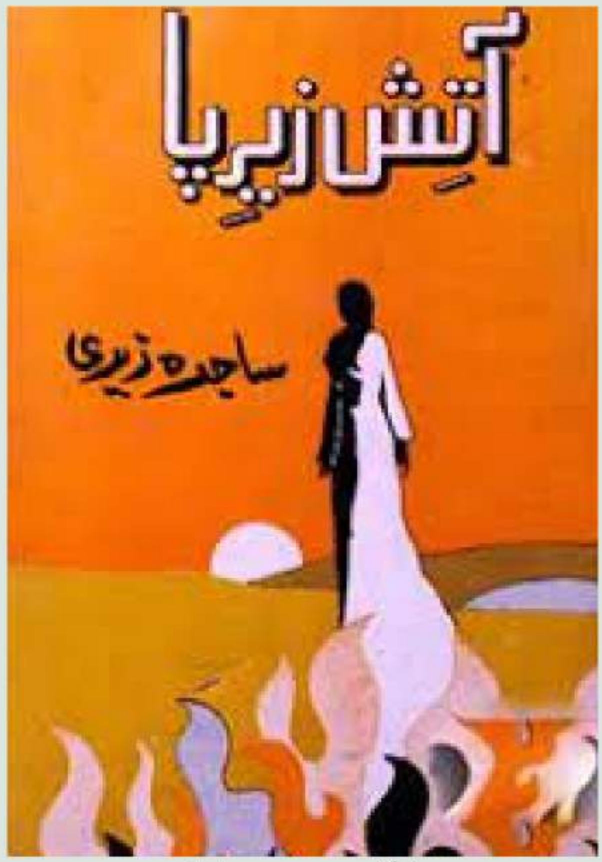

ساجدہ زیدی کی نظموں میں ہجر و وصال کے ساتھ ساتھ یاس و نا امیدی کی کیفیت بھی موجود ہے۔ ان کا غم روایتی غم سے مختلف ہے۔ مٹتی انسانی اقدار، فراموش ہوتی انسانیت، اور رواداری ان کو مضطرب رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں مایوسی کی کیفیت اور ذہنی کرب نمایاں ہے لیکن وقت اور حالات کے پیش نظر ایسی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں:

شکستہ آئینے کو
توڑ کر
بھی کیا ملے گا اب
شکست کے حصار سے
یہ کارواں نکل نہ پائے

(حصار)

ساجدہ زیدی بنیادی طور پر شاعرہ ہیں۔ انھوں نے نظم نگاری پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ غزل کی شاعری ان کے یہاں برائے نام ہی ہے۔ اپنی نظموں کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''میرے ذاتی المیوں کو انسانی تدبیر کے المیوں سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ ہجر و وصال کے نشاط و الم اور زندگی کے دوسرے نشاط و الم میں کوئی کیفیاتی بعد نہیں ہوتا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اکثر نظموں میں داخلی اور ذاتی لے تیز ہے اور بعض پر خارجی حالات کی لے حاوی ہے۔''

(آتش زیر پا، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی 1955، ص:11)

جدیدیت کی تحریک کے زیر اثر بہت سی تبدیلیاں ادب میں بھی رونما ہوئیں۔ بے چہرگی، لامتناہی کیفیت، ابہام، فرد کی تنہائی جیسے جذبات 1960 کے بعد کے ابھرنے والے شاعر و ادیبوں کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کے یہاں نسائی جذبات و احساسات کی عکاسی بھی بے باکانہ انداز میں ملتی ہے۔ ساجدہ زیدی کی بعض نظموں میں عورت کی ان کیفیات کا بھی بیان کیا گیا ہے جو صرف عورت سے ہی منسوب کی جاسکتی ہیں:

آؤ اس ایک لمحے کی لذت میں
ہر آرزو کو سمو دیں
ہر آسودگی سے ملائیں نگاہیں
جسم میں دو جسم و جاں
ایک ہی شاخ کے پکے پھل کی طرح ایسے ٹوٹیں،
کہ جیسے شکست بدن ہی میں تکمیل ہے زندگی کی،
چلو ایک ساعت کے
اس بحر دخار میں غوطہ زن ہوں
کہ دھل جائے ذہنوں کی ساری کدورت
سیاست، مذاہب، شکوک

اور سب فلسفوں کی نفاست

(لمحۂ موجود)

مذکورہ نظم میں انھوں نے عورت کے فطری روپ کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے عورت کے اس روپ کو ابھارا ہے جو اس کی فطرت کا خاصہ رہا ہے۔ لیکن یہ اظہار صرف جنسی لذت تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ایک نئے رشتے کی نوید بھی ہے۔ یہ صرف جنسی لذت کا ذریعہ نہیں بلکہ انسانی رشتوں کو بروئے کار لانے کا عمل بھی ہے۔

ساجدہ زیدی کی نظمیں اسی ماحول اور اسی معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں جہاں انسانوں کے اندر ایک گہری بے بسی اور مایوسی سرایت کر گئی ہے۔ ہم مادی چیزوں میں اس قدر کھو چکے ہیں کہ اب ہمیں ہر چیز احساس سے عاری لگنے لگی ہے۔ ساجدہ زیدی کی اکثر نظموں میں ایسے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے جہاں پر انسان دکھ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ ان میں زندگی کی رمق دمق ختم سی ہوگئی ہے۔ زندگی کی صعوبتوں کے باوجود بھی ان کے یہاں زندگی کے تئیں مثبت رویہ ملتا ہے۔ بے یقینی اور لاحاصلی کی کیفیت کے باوجود بھی ان کے دل میں کسی کا قرب اور ساتھ حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جو تاریک راہوں میں اپنے وجود سے روشنی پیدا کر سکے:

ایک امید سی دل میں
کہ نومیدی کے اس جنگل میں
کہیں شاید کوئی مسکن ہو جہاں
یہ دل زار ٹھہر جائے
ذرا ستائے
اور پھر رخت سفر باندھ کے آگے بڑھ جائے
اس مسیحا کا وجود
واہمہ تھا کہ حقیقت مجھے معلوم نہیں
............اب مگر وہ بھی نہیں

(انکشاف)

ساجدہ زیدی کی بیشتر نظموں میں ابہام جگہ جگہ نمایاں ہے۔ یہ بھی جدیدیت کی تحریک کے پیش نظر سامنے آیا ہے۔ تحریک ورجحانات کا سب سے زیادہ اثر ادب پر پڑتا ہے۔ جدیدیت کی تحریک نے بھی ادب میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کی نتیجتاً اس دور کے ادیب بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ ساجدہ زیدی کی شاعری ہر موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ زندگی کی کشمکش، استحصال، آزادی، تصادم ان کے اہم موضوعات ہیں۔ اقدار کی شکست وریخت بھی ان کی شاعری میں واضح نظر آتی ہے:

میں بتاؤں تمھیں خاموشی کی دیرینہ زباں سے یہ راز
اس تمدن کے کھنڈر میں اے دوست
جھوٹی اقدار کے کھوٹے سکے،
جسم وجاں، قلب ونظر کے بدلے
ہاتھوں ہاتھ اب بھی لیے جاتے ہیں

(مشرق ومغرب کا نقطۂ اتصال)

ساجدہ زیدی نے اپنی نظموں میں عشق ومحبت کے لطیف جذبات کی بھی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے داخلی جذبات واحساسات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ داخلی جذبات کی ترجمانی ان کی شاعری میں اکثر مقامات پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے ان بے نام جذبوں کو بھی زبان دینے کی کوشش کی ہے جو عورت سے منسوب سمجھے جاتے ہیں اور ہماری روایات کا حصہ ہیں۔ داخلی خود کلامی کا اظہار ان کے یہاں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ ان کی کئی نظمیں جذباتی کشمکش کی ترجمانی کرتی ہیں:

کبھی محسوس ہوتا ہے
میں خوشبو ہوں

میں نغمہ ہوں
میں خود معصوم ہونٹوں کی ہنسی ہوں
دل کی دھڑکن ہوں
اک درد ہوں
سوز مجسم ہوں

(وجدان)

ساجدہ زیدی کی شاعری صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنے اردگرد بھی نظریں مرکوز کی ہیں اور معاشرے میں پھیلی بے راہ روی پر بھی تیکھے طنز کیے ہیں۔کہیں کہیں ان کا لہجہ بہت تلخ بھی ہو گیا ہے۔ طبقاتی کشمکش پر بھی ان کا دل کڑھتا ہے اور وہ اس کا اظہار برملا کرتی ہیں:

ننگے زخموں کو پہناؤ، کبھی بے جان ہنسی کی پوشاک
تا کہ تم دیکھنے والوں کی نگاہوں کے ترحم سے بچو
اس سے بڑھ کر بھی کوئی نشتر و پیکاں ہوں گے گے؟

(سناٹے کی آواز)

بے سروسامانی اور ناامیدی کا احساس آج کے انسان کا مقدر بن گیا ہے۔ انسانوں نے انسانوں سے دوری بنالی ہے۔ ہر ایک اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر رہ گیا ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے بالکل بے خبر ہو چکا ہے۔شاعرہ کو کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو ایک دوسرے کے غم کا شریک ہو۔ جو زندگی کی تاریک راہوں میں اپنے وجود کا احساس کرا سکے:

جستجو کا صحرا
نگاہوں کے بگولے
دل کی آنچ
کسی تراہے پر جھلستی دوپہر میں
رک گیا ہے زیست کا رقص تمام؟
کون میرا ہم سفر تھا
کس کو میں آواز دوں؟

(رقص ناتمام)

ساجدہ زیدی کی شاعری میں ہجر ہے، گھٹن ہے، نامساعد حالات ہیں، نوعمر لڑکی کے جذبات ہیں، سیاسی وسماجی انتشار ہے، اپنے وجود کو منوانے کی کوشش ہے:

میں کوہسار کی صبح نو میں ڈھلی
شوخ کرنوں کی
ان کہی داستاں ہوں

سمندر کی پرشور موجوں میں ملبوس،
اک جسم عریاں ہوں
دریاؤں کا تند پانی ہوں
اور آبشاروں کی بیکل روانی ہوں،
سیال ہے میری ہستی کا جوہر

(امید)

ان کے دوسرے شعری مجموعے ''آتش زیرپا'' کے پیش لفظ میں ساجدہ زیدی نے اپنی اس رائے پر کہ میں نے شاعری کیوں کی کا جواب وہ اس طرح دیتی ہیں:

''شاعری کیے بنا میرے لیے زندہ رہنا مشکل ہوتا۔اور زندگی کا جواز ڈھونڈھنا اور بھی مشکل........اب دیکھیے نا،اس دنیا میں کتنی بے انصافیاں، بدعنوانیاں اور ظلم و استحصال ہے۔کس قدر کرپشن ہے(سیاسی اور سماجی) ملکوں، قوموں اور ثقافتی گروہوں کے مظلوم کس طرح کیڑے مکوڑوں کی طرح مر رہے ہیں۔اور ظالم کس طرح چین کی بنسی بجا رہے ہیں....ظلم و جبر کے کتنے بہانے ہیں، کتنا جھوٹ ہے، کتنا دکھ ہے، کتنا اندھیرا ہے؟ کس قدر اندھیرا ہے کہ اگر انسان اپنی چھوٹی سی مشعل ساتھ لے کر نہ چلے تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے.....ایسی دنیا میں کسی منصب، کسی عظیم سچائی کی تلاش، کسی عبادت کے بغیر کیسے جئے....؟ میری شاعری میرے اسی روحانی کرب کا اظہار ہے۔''

(آتش زیرپا،ص:7)

ساجدہ زیدی کی شاعری میں عورت کے دکھ کے ساتھ ساتھ سماج کے تئیں ناراضگی کا بھی اظہار ملتا ہے۔ان کی شاعری سماجی الیے کی نشاندہی کرتی ہے۔ان کی نظم میں عورت اپنی ذات کے بارے میں خود ہی سوال کرتی ہے اور پھر خود ہی ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی سعی کرتی ہے۔نظم 'میں وہ تصویر نہیں' میں کچھ ایسے ہی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے:

مجھ کو سمجھا گیا
بانکپن اور ادا،
شرم وحیا
رمز تبسم، نگہ لطف کے تیر/کالی زلفوں کی گھٹا، دست حنائی کا کرم
یہی سرمایۂ ہستی ہے مرا

ہیں یہی میرے ہتھیار
فلسفہ، شعر،
تڑپ دل کی
تمنا کا طلسم
ردِ ہستی کی چبھن
آبلہ پائی کی اساس
تلخ کامی کی مٹھاس
لوگ سمجھے کہ مری ذات کا حصہ ہی نہیں
مجھ کو ہنگامۂ عالم سے سروکار ہی کیا؟
میں یونہی گھٹتی
سکڑتی رہی لمحہ لمحہ
اور، لوگوں کی انا بڑھتی رہی
پھولتی، پھلتی رہی

(میں وہ تصویر نہیں)

ساجدہ زیدی کی بہت سی نظمیں 'میں' سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ زندگی کی تلخ سچائیوں کو اسی 'میں' کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ کبھی یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں گم ہیں۔ وہ اسی 'میں' کے ساتھ زندگی کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ ان کا ذہن و دل کسی شے کی تلاش میں مضطرب ہے:

یقین، حسن، محبت، وفا، امید، قرار
چھڑا کے چل دیے دامن
میں دیکھتی ہی رہی
کہ یہ طویل سفر، یہ مہیب تنہائی،
کہیں نہ ڈس لے مجھے راستوں کی پہنائی،
مگر یہ قدرت فیاض مہرباں نکلی،
قدم بڑھانے سے پہلے مجھے رفیق بنا دیا
جو میرے ساتھ رہا اس سفر میں اس طرح
کہ جیسے ذہن و دل و روح و جسم و جان و نظر
سبھی پہ اس کا اجارہ
سبھی ہیں اس کا گھر،
میں سوچتی ہوں مگر!

(سوچ)

ان کے شعری مجموعے ''آتش زیر پا'' میں ان کی ایک نظم ''جب جیون ساگر ٹھہر گیا'' کے عنوان سے ہے۔ ان کی شعری زبان ان کے اندرون کی زبان ہے جو ان کے داخلی اور خارجی حالات کو بیان کرتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے جو اسلوب اپنایا ہے وہ بہت سادگی لیے ہوئے ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آسان زبان میں بھی شاعری کر سکتی ہیں۔ آسان اور عام زبان کے وہ الفاظ جو قاری کو متاثر کرتے ہیں ان کی نظم میں موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کی نظم 'سب اپنے ہی من کا درپن تھے':

یہ جیون ساگر جل تھل تھا
موجوں کا ہر سو میلا تھا
لہروں کے سفینے بر ہن کے
گیتوں کی طرح آوارہ تھے
چنچل کرنیں
بے باک پون
اونچے پربت
کالے بادل
اڑتی تتلی.....رنگوں کی پری
ہنستی کلیاں....لہراتے کنول
ڈالی ڈالی گاتے پنچھے
شبنم شبنم.....ہیرے کی انی

(سب اپنے ہی من کا درپن تھے)

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساجدہ زیدی کی شاعری پر جدیدیت کا اثر ہے۔ ان کی شاعری آزادانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ ان کے یہاں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ وہ لمحۂ فکریہ بھی موجود ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ زندگی اور اس سے متعلق مسئلے کو سوچنے اور سمجھنے کی انھوں نے کامیاب سعی کی ہے۔ ساجدہ زیدی نے انسان کے ان تمام مسائل کو بحث کا موضوع بنایا ہے جس سے ہر انسان دو چار رہتا ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں کہیں مشکل پسندی دکھائی دیتی ہے لیکن ایسا بہت کم ہی ہوا ہے۔ شعری روایت کا رچا ہوا شعور ان کو شاعرات کی صف میں بلند مقام عطا کرتا ہے۔

□□□

Dr. Musarrat
New Delhi

ڈاکٹر عنبر عابد

ممتاز شخصیت
ممتاز صدیقی

مجھ میں ہے تھوڑی بہت جو بھی یہ فن کی خوشبو
در حقیقت ہے مری ماں کے سخن کی خوشبو

میرے سامنے ایک کتاب رکھی ہوئی ہے...... ایک دستاویز...... کتاب نما دستاویز کے ہر ورق کی چشم دید گواہ ہوں۔ اس کتاب کا ایک ایک لفظ میں نے عمر و شعور کی سیڑھیاں چڑھتے سنا پڑھا اور محسوس کیا ہے۔ یہ کتاب میری متاعِ حیات ہے جس کا عنوان ہے "آئینہ پسِ آئینہ" محترمہ ممتاز صدیقی صاحبہ جو کہ خوش قسمتی سے میری والدہ تھیں یہ ان کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔

مسلسل پھڑ پھڑاتے ان صفحات پر یکلخت میں اپنا ہاتھ رکھ دیتی ہوں...... الفاظ میری ہتھیلی میں گویا جذب سے ہونے لگے ہیں...... اور میری شریانوں میں میرے لہو کے ساتھ سرایت کرنے لگتے ہیں...... اور میں قلم اٹھا کر لکھنے بیٹھ جاتی ہوں!

کبھی شہرِ دل سے گزرو تو سنبھل کر پاؤں رکھنا
یہاں فرش ہے گلوں کا کئی آئینے رکھے ہیں
(ممتاز صدیقی)

میری امّی محترمہ ممتاز صدیقی صاحبہ کی پیدائش 10 جون 1947 کو اچھاور میں ہوئی تھی۔ ان کے والد جناب حاجی اعجاز احمد صاحب تھے۔ ان کا گھرانہ انتہائی مذہبی اور اخلاقی اقدار کا پابند تھا۔ امّی اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی والدہ ماجدہ سکینہ بی بی انتہائی مخلص نیک سیرت اور گھریلو خاتون تھیں۔ حاجی اعجاز احمد صاحب انتہائی بردبار اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ نفاست اور سلیقہ ان کے اطوار کا خاصہ تھا۔ اعجاز صاحب بے حد باذوق اور سخن فہم شخص تھے۔ ہزاروں اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ تعلیم سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ تعلیم کو وہ کچے ذہنوں کی نشوونما مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بچّوں کی بہتر تعلیم و تربیت کی۔ گھر پر ہی بہترین اساتذہ کا انتظام کیا اور اردو و عربی، فارسی، انگریزی زبانوں کی تدریس کا سلسلہ چلتا رہا۔ نماز، روزہ، پردہ اور اخلاقیات اس گھر کی پاکیزہ فضا تھی۔ ایسے ماحول میں (امّی) ممتاز صدیقی صاحبہ کی پرورش ہوئی اور ابھی عمر کوئی پندرہ سولہ سال رہی ہوگی کہ حاجی ریاض احمد صاحب جو کہ امّی کے اکلوتے بھائی تھے انھوں نے پاکستان شفٹ ہونے کا ارادہ کرلیا اور امّی کی شادی بھوپال میں آباد ایک سادات خاندان میں کر دی گئی اور نانا جان اپنے بیٹے کے ہمراہ پاکستان جا بسے۔ امّی اور باقی کی چار بہنیں یہیں ہندوستان میں رہ گئیں۔ شادی کے بعد ہم بہن بھائیوں کی پرورش کے ساتھ والدہ محترمہ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور اردو میں ایم.اے. تک تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی شعروسخن کا سفر بھی جاری رہا۔ اور یہاں سے شروع ہوتے ہیں امّی کے وہ حالات جن سے میں

ذاتی طور سے واقف ہوں۔ میں نے امّی کو ہمیشہ اپنے والدین کو بیحد یاد کرتے دیکھا...... ان دنوں خط ہی خیریت کا ذریعہ تھے.......... جب نانا جان کا خط آتا تو امّی کا چہرہ کسی گلاب کی مانند کھل اٹھتا۔ وہ نانا جان کے خط کو بار بار پڑھتیں، بوسہ دیتیں اور آنکھوں سے لگاتیں۔ میری عمر اس وقت کوئی آٹھ دس برس کی رہی ہوگی۔ گھر کے ماحول میں اردو رچی بسی تھی۔ چونکہ میں اردو پڑھ لیا کرتی تھی اس لیے نانا جان کا کوئی خط آتا تو میں وہ خط پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس خط میں ایک باپ کی شفقت کا خزانہ پنہاں ہوتا تھا۔ لفظ موتیوں کی مانند...... صاف شفاف تحریر کئی اشعار سے مرصع خط۔ یہ اشعار زیادہ تر اقبال کے ہوتے۔ اس تحریر میں ایک باپ کی شفقتوں کا دریا موجزن رہتا اور ان کے ہر خط میں عزم و ہمت کا ایک پیغام مضمر ہوتا کسی بھی لفظ میں یاس وحسرت یا مایوسی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہی حوصلہ اور ہمت نانا جان کی شخصیت کا اہم جز تھی۔ ان کی ہر تحریر اسی عمل کی غماز ہوا کرتی تھی۔ گھر کے ادبی ماحول ...... اور پڑھنے لکھنے کے شوق نے بہت پہلے ہی والدہ صاحبہ کو شعر گوئی کی طرف مائل کردیا تھا۔ وہ بتاتی تھیں کہ میری ہر کاپی پر منتخب اشعار ہوتے تھے اور پھر وہ خود بھی 11/سال کی عمر میں شعر کہنے لگی تھیں۔

ہم پانچ بہن بھائیوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں وہ مصروف رہیں۔ اسکولی تعلیم علیحدہ لیکن ہمارے گھر کا ماحول خاص ادبی تھا۔ اردو ہم سب پڑھتے لکھتے رہے اور اردو سے واقفیت رہی۔ اپنے پانچ بھائی بہنوں میں، عنبر عابد سب سے بڑی، پھر حنا عابد جو کہ امریکہ نیویارک میں مقیم ہیں، پھر عادل حسین اور زرقاء یہ دونوں عابد ریاض (سعودی عرب) میں مقیم ہیں، سب سے چھوٹی صدف اور میں بھوپال میں ہی ہیں۔ ہمارے والد محترم جناب سیّد عابد حسین صاحب ایک بیحد مخلص و باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

وقت اور حالات کے ساتھ امّی کے ذوق وشعور میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے اردو اکیڈمی میں چلنے والے اردو کیلی گرافی کورس میں داخلہ لیا۔ اس وقت مرحوم فضل تابش صاحب اردو اکیڈمی کے سکریٹری تھے۔ اس ادبی ماحول نے محترمہ کے ذوق کو جلا بخشی اور کچھ ادبی نشستوں میں محترمہ نے شرکت کی...... اور بھوپال کی ادبی فضا میں ایک تازہ جھونکے کی طرح محترمہ کے فن کی خوشبو پھیلتی چلی گئی.......... مقامی مشاعروں سے نکل کر ہندوستان کے دیگر شہروں تک اور پھر بین الاقوامی مشاعروں میں ممتاز صدیقی صاحبہ کی شرکت ہونے لگی۔

ایک باوقار طرح دار، خوش گفتار، خوش لباس خاتون ممتاز صدیقی صاحبہ کی شخصیت کو اگر سحر انگیز شخصیت کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ زیرلب مسکراہٹ، آنکھوں میں حیا، چہرے پر وقار، متانت وسنجیدگی لیے جب وہ کلام پڑھتیں تو لوگ مسحور ہوجاتے۔ یہاں میں ضروری سمجھتی ہوں کہ اپنی رائے بعد میں دوں اس سے پہلے محترمہ کے بارے میں جوان کے ہم عصروں کی رائے تھی اسے آپ کے سامنے پیش کروں جنھوں نے ان کی شخصیات اور فن پر اظہار خیال کیا ہے۔

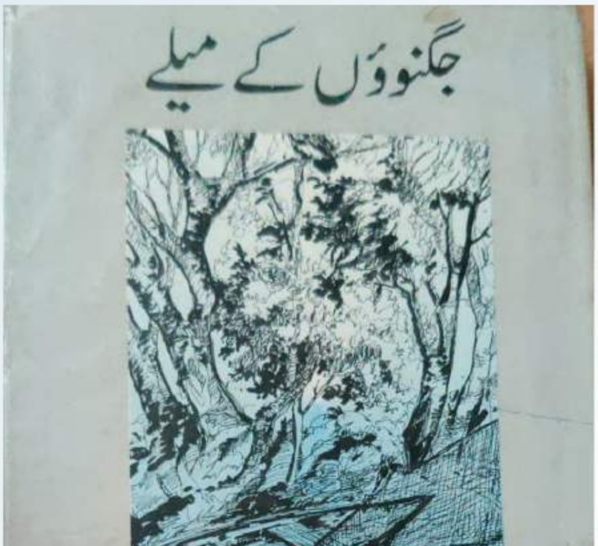

بہت کم شخصیات اتنی خوش قسمت ہونگی جن کے فن کو ان کی زندگی میں سراہا جائے .... اور انھیں ادب کی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل ہو۔ محترمہ ممتاز صدیقی اپنے نام کی طرح اپنے دور میں ممتاز رہیں۔ کئی مشاہیر ادب نے ان کے فن اور شخصیت پر مفصل اظہار خیال کیا ہے جو مکمل تو نہیں مختصر طور پر میں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ ہو۔

بقول پدم شری ڈاکٹر بشیر بدر:

''ممتاز صدیقی غزل کی ایک سچی عبادت گزار ہیں اور قابل قدر بات یہ ہے کہ ممتاز صدیقی صاحبہ ہندوستان کی ان چند شاعرات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے اپنی غزل

گوئی میں ایسی کامیابی حاصل کی ہے جو انھیں ہند و پاک کی قابلِ ذکر شاعرات کے قافلے میں شریک کرتی ہے۔"

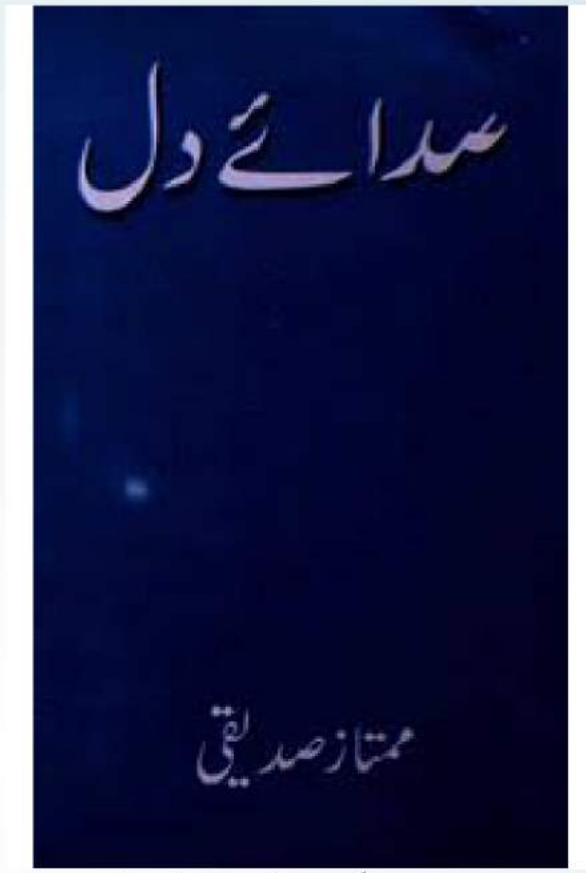

دسمبر 2005 میں امّی کا نیویارک اپنی بیٹی حنا کے پاس جانا ہوا۔ یہاں ان کے اعزاز میں کولمبیا یونیورسٹی کے جارج برنارڈ شاہ ہال میں اعزازی مشاعرہ کے علاوہ کوئنس جیکسن ہائٹ اور مین ہٹن میں بھی کئی مشاعرے اور دعوتیں منعقد کی گئیں اور کئی نثر نگاروں نے امّی کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کیا اور مختلف مقامی اخبارات میں یہ آرٹیکل شائع ہوئے۔

پروفیسر خالدہ ظہور، نیویارک :

"ممتاز جذبوں کی صداقت کی ترجمان ہیں ۔ وہ چادر و چہار دیواری کی حدود میں رہتے ہوئے بھی متوسط طبقے کی نمائندہ شاعرہ ہونے کا حق بڑی خوش اسلوبی سے ادا کرتی ہیں۔ ممتاز کی آواز پردوں اور چلمنوں کے پیچھے چھپی ہوئی خواتین کی آواز ہے۔ اس آواز میں بڑا خلوص و صداقت ہے کیونکہ یہ وقت و حالات کے تھپیڑے کھانے کے بعد آزمائشوں کی بھٹی میں گزر کر کندن بن گئی ہے۔"

اختر سعید خاں مرحوم بھی والدہ کی شعری حیثیت سے واقف تھے۔ انھوں نے کہا تھا :

"ممتاز صدیقی نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے چار مجموعے طبع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں جو انتہائی دل پذیر اور خوبصورت غزلوں، نظموں، قطعات اور گیتوں سے آراستہ ہیں۔ ممتاز صدیقی اپنے وراثتی مشرقی تہذیب کے وقار اور قدروں کی پاسداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک شاعرہ کی حیثیت سے اپنی شخصیت کو تسلیم کرانے میں کامیاب رہی ہیں۔ مجموعی طور پر ممتاز ایک فطری شاعرہ ہیں۔"

ماہرِ نظم رہبر جونپوری کے الفاظ میں :

"یوں تو ممتاز صدیقی صاحبہ غزل کی شاعرہ ہیں لیکن ان کی آزاد نظمیں جو کہ جذبات و احساسات کے پیکر میں ڈھلی ہوئی ہیں انھیں پڑھ کر شاعرہ کی فکر کی بلند پروازی کی داد دینی پڑتی ہے۔"

رشید انجم بھوپال کے معروف ادیب ہیں۔ "آئینہ پسِ آئینہ"

کے بیک کور پر انھوں نے لکھا ہے:

''ممتاز صدیقی بھوپال کی ان شاعرات کی صف اوّل کی تخلیق کار ہیں جن کے اشعار بادِ نسیم کے لطیف اور خوشگوار جھونکوں سے ذہن کو راحت بخشتے ہیں۔ ان کے اشعار میں رومان کا جمالیاتی تصور بھی ہے اور حالات و معاملات کا دشوار آہنگ بھی۔ ممتاز صدیقی ہمارے عہد کی واقعی ممتاز شاعرہ ہیں جن کی شاعری میں مہکے ہوئے گلزار کی مانند کلاسکی رنگ و آہنگ کا جمال نمایاں ہے۔''

اسی طرح بھوپال کے ممتاز اور صفِ اوّل کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی ان کے کلام کو سراہا ہے۔

''ممتاز صدیقی صاحبہ بھوپال کی وہ نامور شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنے مجموعہ کلام ''جگنوؤں کے میلے'' میں جو نظمیں شامل کی ہیں ان میں انھوں نے اپنے عہد کی دہشت گردی، نفسیاتی بدنظمی، اخلاقی بے اعتدالی اور ثقافتی فتنہ طرازیوں کا سلیقہ سے احاطہ کیا ہے جو متوسط مسلم طبقے کی اجتماعی سائیکی کا حصّہ ہیں۔'' (اقبال مسعود)

''ممتاز صدیقی صاحبہ اپنے تجربات و مشاہدات کو غزل کے توسط سے سات رنگوں کی دھنک میں ڈھالنے کے فن میں ماہر ہیں۔'' (ڈاکٹر مہتاب عالم)

''محترمہ ممتاز صدیقی صاحبہ کے طرز کلام میں ایک خاص صفت یہ نظر آتی ہے کہ وہ اشارے کنائے میں بہت محتاط ہیں اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ تحریم و تکریم بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔ ان کا طرزِ سخن شرم و حیا کا پابند ہے۔ میں برسوں سے مشاعروں میں اُن کا کلام سنتا آرہا ہوں اور عوام سے داد وصول کرتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہوں۔ اب ان کی شہرت ملک کی حدوں سے نکل کر سمندر پار پہنچ گئی ہے۔ ان کی بڑی صاف شستہ زبان اور لہجے کی نسائیت بڑی سادگی کے ساتھ صنفِ نازک کی ترجمانی کرتی ہیں۔'' (ظفر نسیمی)

''ممتاز صدیقی رونق محفل ہوا کرتیں تھیں.......... زیرلب ہلکی مسکراہٹ لیے جب وہ محفل میں جلوہ افروز ہوتیں تو ہر ایک کی نگاہ اُن پر ٹھہر سی جاتی۔ وہ سبھی سے محبت سے ملتیں، خیر و عافیت طلب کرتیں۔ حسن سلوک، بہترین لباس اور نفاست ان کی شخصیت کی خاص پہچان تھی۔ شعر کہنے کے ساتھ ساتھ انھیں شعر پڑھنے کے ہنر میں بھی مہارت حاصل تھی۔'' (خالدہ صدیقی)

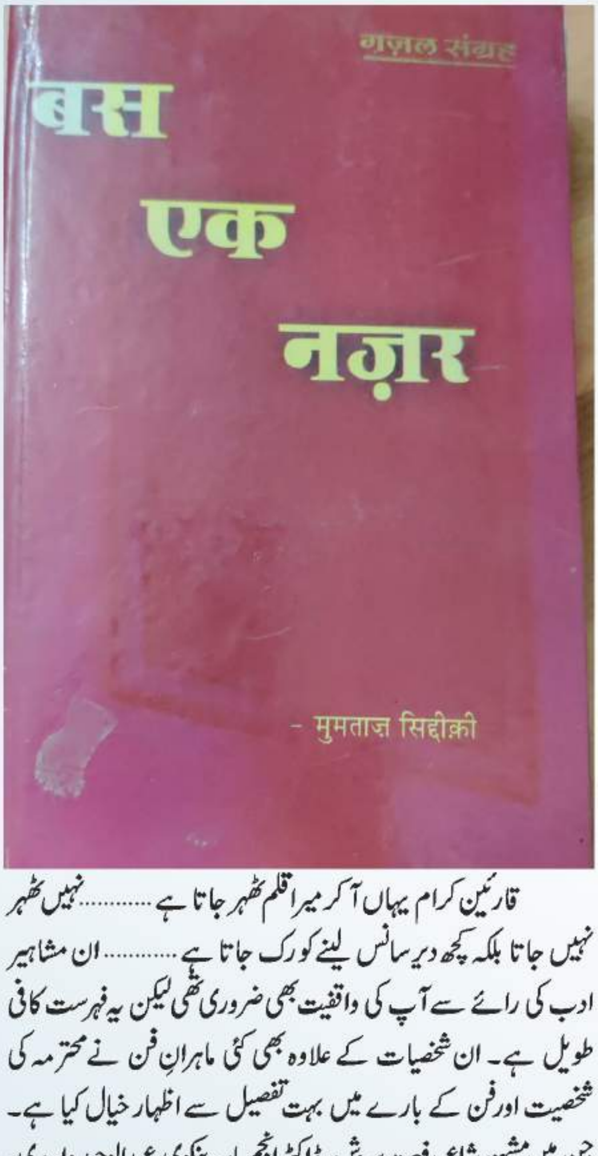

قارئین کرام یہاں آکر میرا قلم ٹھہر جاتا ہے .... نہیں ٹھہر نہیں جاتا بلکہ کچھ دیر سانس لینے کو رک جاتا ہے .... ان مشاہیر ادب کی رائے سے آپ کی واقفیت بھی ضروری تھی لیکن یہ فہرست کافی طویل ہے۔ ان شخصیات کے علاوہ بھی کئی ماہرانِ فن نے محترمہ کی شخصیت اور فن کے بارے میں بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ جن میں مشہور شاعر رفعت سروش، ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی، عبدالوحید واحدی، علی عباس امید، انعام اللہ خاں لودھی، محترمہ شگفتہ فرحت، اعجاز عفی عنہ، محمد صادق اختر حسین شیخ محترمہ سیما بدایونی صاحبہ، طیبہ بلگرامی، ڈاکٹر اعظم، رمیش شرما (سہارا نیوز)، رمیش نند وغیرہ شامل ہیں۔

ان تمام حضرات کی رائے کے بعد میں ڈاکٹر عنبر عابد جیسے خوش قسمتی سے محترمہ ممتاز صدیقی صاحبہ کی سب سے بڑی بیٹی ہونے کا شرف حاصل ہے، ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیسے کہاں سے اور کس طرح کروں؟

ایک ایسی شخصیت جو بیک وقت میری والدہ ہونے کے ساتھ میری راہبر، میری دوست و ہم نفس ہی نہیں بلکہ زندگی کی تمام تاریک راہوں کی واحد مشعلِ راہ تھیں مجھے کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی ہے جب میں امّی کی شخصیت کا تجزیہ کرتی ہوں ایک طرف زندگی کے ناموافق حالات اور دوسری طرف ان کا بیحد حساس دردمند دل لیکن اسی حساس دل کی زمین پر عزم و ہمت اور حوصلے کی ایک داستان رقم تھی۔ محترمہ نے کبھی حالات سے گھبرا کر مایوسی کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ ہمت اور حوصلے سے ...... تدبیر سے تقدیر کا رخ پلٹنے کی کوشش کی۔ ان کی زندگی ایک جہد مسلسل تھی اور ہم اولادیں ہی ان کا کل سرمایۂ حیات تھیں۔ اپنے بچّوں کے بہترین مستقبل کے لیے، بہتر تعلیم و تربیت کے لیے وہ تا زندگی کوشاں رہیں۔ اور یہی سبق انھوں نے ہم پانچوں بہن بھائیوں کو دیا کہ حالات گھبرانے سے نہیں سامنا کرنے سے بدلتے ہیں۔

والدہ محترمہ کی زندگی میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہے جس کے ہر صفحہ پر ان کے تجربوں کی داستان رقم ہے۔ خونِ جگر کی روشنائی سے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر احساس و جذبات کی ایسی عکّاسی کی ہے کہ جو بڑی واضح و دلکش...... اور زندگی کے قریب تر ہے...... لیکن تخلیق کار اپنے فن میں اس قدر ماہر ہے کہ اس نے اپنی اس تخلیق کے پس منظر میں شیشہ استعمال کیا ہے ...... اور اس شیشے سے جھانکتا ہوا قاری جہاں ایک طرف اس تخلیق کی ستائش تو کرتا ہے لیکن اسے اس فن پارے میں اپنا عکس بھی صاف نظر آتا ہے اور یہی شاعری کی معراج ہے جب شاعر کے کلام میں آفاقیت کا عنصر شامل ہوجائے اور قاری کو اس میں اپنا آپ نظر آنے لگے۔

یہ میرے خون سے لکھی ہوئی تحریریں ہیں
میرے احساس کی منہ بولتی تصویریں ہیں

(ممتاز صدیقی)

والدہ محترمہ ممتاز صدیقی صاحبہ کی زندگی کسی دریا کی مانند میری آنکھوں کے سامنے موجزن ہے...... جس میں احساسات کی اٹھتی مچلتی لہریں اور جذبات کے بنتے بگڑتے بھنور ہیں ...... خیالات کی گہرائی اور فکر کی بلند پروازی بھی موجود ہے۔ اس دریائے سخن کی تہہ میں شوخی، لطافت، محبت، درد، محرومی جیسے گوہر نایاب پنہاں ہیں۔

اخلاقی حدود و پابندیوں کی پاسداری کرتے ہوئے محترمہ نے جس طرح اپنا شعری سفر طے کیا وہ قابل ستائش ہے۔ بھوپال کے ادبی حلقوں میں محترمہ کی بے پناہ مقبولیت تھی اور ہے۔ ہر خاص و عام میں ادب و احترام سے ان کا نام لیا جاتا رہا ہے۔ حسن سلوک ان کی خاص پہچان رہی۔ خلوص، محبت، اخلاق، مسکراہٹ اور گفتگو کے فن میں ماہر گویہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔

ابھی ابھی تو سب کچھ ٹھیک تھا...... حالات سازگار تھے۔ میں بچّوں کی شادی کی تیاری میں مصروف تھی۔ محترمہ امریکہ نیویارک سے گرین کارڈ کے لیے سفر کرکے واپس لوٹی تھیں...... ہم سب بھائی بہن ایک عرصہ طویل کے بعد جمع ہوئے تھے۔ امّی خوش تھیں لیکن امریکہ کا سفر پھر لاحق تھا۔ چھ ماہ میں انھیں دوبارہ وہاں جانا تھا۔ شاید اس بار وہ جانا نہیں چاہتی تھیں۔ کیوں؟ یہ بعد میں سمجھ آیا۔

وہ 20/فروری 2018 کی شام تھی۔ امّی امریکہ جارہی تھیں۔ ان کی طبیعت کچھ مضمحل سی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کو بھیجنا تھا کیونکہ سب بھائی بہنوں کی شادی کے بعد اب مجبوری یہ تھی کہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ امّی اکیلی تھیں۔ ان کے اچھے علاج اور بہتر نگہہ داشت کے لیے ہی انھیں امریکہ بھیجنا طے ہوا تھا۔ سامان گاڑی میں رکھا جاچکا تھا۔ امّی بیٹھ رہی تھیں۔ انھوں نے بڑھ کر میرا ماتھا چوم لیا تھا اور بہت دیر سینے سے لگائے رکھا۔ میں ضبط کرتے ہوئے مسکرادی اور انھیں بہلاتے ہوئے کہا ہم جلد ہی ملیں گے انشاء اللہ۔ امّی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مجھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

وقت رخصت جو پلٹ کر ہمیں دیکھا اس نے
اک قیامت سی تھی گزری جو ہمارے دل پر

(ڈاکٹر عنبر عابد)

”ارے اب کیا ملیں گے“......

کہتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ گئیں اور گاڑی روانہ ہوگئی......

اور اس لمحے میری زندگی کی سب سے قیمتی شئے مجھ سے جدا ہوگئی۔

وہاں امریکہ میں وہ خوش تھیں۔ سب کچھ ٹھیک تھا کہ 23 مارچ کی دوپہر امّی گھر میں ہی ایک ناگہانی حادثہ کا شکار ہوگئیں۔ وہ مسہری سے گر پڑی تھیں، سر میں اندرونی چوٹ تھی...... اس کے بعد سرجری! نتیجہ...... ایک ہفتہ لائف سپورٹ پر رہیں لیکن کوئی امپروومینٹ نہ ہوا۔ بالآخر 5/اپریل کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔

میری راہوں کے تمام روشن چراغ بجھ گئے۔ سبھی بھائی بہن اس اچانک حادثہ سے دہل کے رہ گئے۔

آج بھی ان کا شفیق سراپا میری آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی تھیں ”میں نے جتنی دعائیں تمھارے لیے کی ہیں اتنی

کسی کے لیے نہیں کیں۔'' اور آج میں جو کچھ بھی ہوں انھیں کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ امّی کے زیرِ سایہ ہم بھائی بہن بچّے تھے لیکن ان کے چلے جانے سے اب ہم والدین ہوگئے ہیں۔

بھوپال کے ادبی حلقوں میں آج بھی ان کے تذکرے ہوتے ہیں۔ ان کی اچانک رحلت سے بھوپال کے ادب کو ایک بہت بڑا نقصان ہوا۔ آج بھی جب میں کسی ادبی محفل میں شرکت کرتی ہوں تو لوگ مجھ میں امّی کو تلاش کرتے ہیں اور میری مضطرب نگاہیں امّی کو ڈھونڈتی رہتی ہیں کیونکہ ہر محفل میں وہ میرے ہمراہ ہوتی تھیں۔

اب تک محترمہ کے پانچ شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ بساطِ دل، صدائے دل (شعری مجموعے)، جگنوؤں کے میلے (منظومات)، بس ایک نظر (ہندی)، آئینہ پسِ آئینہ (شعری مجموعہ)۔ مجھے ان کے شعر کہنے کے فن سے والہانہ لگاؤ ہے۔ خوبصورت الفاظ اور بہترین تراکیب ان کے کلام کی اہم خصوصیات تھیں۔ محترمہ کی شاعری وقت کا آئینہ ہے جس میں نسائی جذبات واردات قلب و جگر، محرومی، نارسائی جیسے موضوع اٹھائے گئے۔ لیکن اظہارِ خیال میں ایک خالص مشرقی حیا اور جھجک بھی وہ ملحوظ رکھتی ہیں۔ وہ کہیں بھی احتیاط اور اخلاقی قدروں کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ کبھی ماں بن کر کبھی بیٹی بن کر کبھی محبوبہ بن کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے فن میں ماہر تھیں۔

بھوپال کے ادبی حلقوں سے محترمہ کی شہرت کا آغاز ہوا اور گزشتہ دہائی میں انھیں ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ رسالوں، اخباروں میں اکثر ان کا کلام پڑھا جاتا رہا۔ ٹی وی، ریڈیو کے پروگرامز میں بھی شرکت رہی۔ سنجیدہ اور ادبی مشاعروں میں انھیں نمایاں شہرت اور کامیابی ملی۔ شعر و ادب میں محترمہ کا نسائی لہجہ اپنی الگ پہچان رکھتا تھا۔ ناموافق حالات کو الفاظ کا پیکر عطا کر کے شعری رنگ میں ڈھالنے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ ان کا کلام صداقت کا بیان ...... جذبات کا ترجمان اور ناکام محبت کی داستان ہے۔

اپنے بچّوں کے لیے کہی گئی محترمہ کی نظمیں اور غزلوں میں وہ ایک قابل شاعرہ ہی نہیں بلکہ ممتا کی دیوی بھی نظر آتی ہیں۔

میرے بچّوں کی جوانی ہے جوانی میری
پھر نئی ہوگئی تصویر پرانی میری
تیرے لہجے میں ہے اندازِ تکلم میرا
تیری گفتار میں رنگین بیانی میری
تیری صورت میں کئی عکس عیاں ہیں میرے
بنا عنوان بدلتی ہے کہانی میری
بعد میرے بھی نظر آئے گا پیکر میرا
ڈھونڈ ہی لیں گے کوئی لوگ نشانی میری

اس نظم میں ایک شفیق اور مہربان ماں کا پیکر نمایاں ہے جو اپنے بعد بھی اپنے جذبات تشنہ چھوڑ جاتی ہے............ ان کی کئی نظمیں قابلِ ذکر ہیں جیسے چیختی تنہائیاں، بے فکری کے روشن دان، ماں، ممتا کا سایہ (گجرات کے زلزلے کا تذکرہ)، بیٹی، نیند، تنہائیوں کی محفل، عشق، عمر کا سوکھا ساون، جگنو جیسی امیدیں وغیرہ۔

گہوارۂ ادب بھوپال کی سرزمین سے ابھرنے والی محترمہ کی شہرتوں اور مقبولیت نے نہ صرف اپنے شہر یا صوبے کا ہی نام بلندیوں تک پہنچایا بلکہ عالمی پیمانے پر شمار کی جانے والی شاعرات میں وہ اپنا ایک ممتاز مقام پانے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔

ان کی اچانک اور بے وقت رحلت سے بھوپال کے اردو حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص کی زبان پر ان کے اندازِ گفتگو، اخلاص و محبت کی داستانیں ہیں۔ میں جس سے ملتی ہوں تو لگتا ہے وہ انھیں کے زیادہ قریب تھیں۔

''ہر شخص تیرا نام لے ہر شخص دیوانہ ترا''

نماز، روزہ عبادات، بچّوں کی پرورش، حسنِ سلوک، محنت، ہمت و حوصلہ اور سلیقہ ایسی کون سی صفات تھی جو ان میں نہیں تھیں۔ اپنے آپ میں خود اپنی مثال آپ تھیں وہ۔ بروقت وہ ایک ممتاز شاعرہ اور اپنے عہد کی ممتاز شخصیت رہیں لیکن ان سب سے زیادہ وہ ایک نیک دل اور بیحد مخلص خاتون اور دنیا کی سب سے اچھی ماں تھیں۔

امّی کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ میں ان پر کہے اس شعر کے ساتھ اپنی بات کا اختتام کرتی ہوں کہ یہ تو وہ موضوع ہے کہ میں کتنا بھی لکھ دوں ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا''

اے مری ماں مری جنت مری تسکینِ حیات
تھی دعاؤں میں تری سارے مسائل سے نجات

□□□

Dr. (Mrs.) Amber Abid
H. No.14
Near Mohammadi Masjid
Khawaspura Shahjahan Aabad
Bhopal-462001 (M.P)

ڈاکٹر شاہد ساز

منی بائی حجاب

کلکتے کی ایک مشہور طوائف شاعرہ

نام منّی بائی، تخلص حجاب تھا اور منجھلی کے نام سے مشہور تھیں۔ اردو کے قدیم تذکروں مثلاً تذکرۂ بہارستان ناز، تذکرۂ نشاط افزا، تذکرۃ النساء، تذکرۃ الخواتین، تذکرۃ النساء نادری، تذکرۂ مشاہیر نسواں، تذکرۂ نسوانِ ہند، اردو شاعرات بنگالہ وغیرہ میں حجاب کا ذکر ملتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں داغ دہلوی کی داستان عشق کی وجہ سے ان کا نام زندۂ جاوید رہے گا۔ حجاب کلکتہ کی مشہور طوائف کے علاوہ ایک شاعرہ بھی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ موسیقی میں بھی طاق تھیں۔

وفا راشدی نے حجاب کی شخصیت، سیرت، خوبصورتی، پیشہ، شاعری پر مختصر مگر جامع خاکہ پیش کیا ہے:

> ''منّی بائی کے نام میں اتنی کشش، اتنی موسیقیت و معنویت تخلص حجاب میں ایسی شعریت، غنائیت اور رومانی کیفیت ہے کہ اس کی کشش انگیز شخصیت اور زندگی سے بھرپور شاعری کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ تجسس و تلاش سے مزید انکشاف ہوا کہ وہ نہ صرف پُرگو شاعرہ تھیں بلکہ ایک دیوان بھی اس کی یادگار ہے۔ اس کے شاگردوں میں کئی اہم شاعرات کے نام بھی آتے ہیں۔ حجاب کلکتہ کی ہردلعزیز ڈیرہ دار طوائف تھی۔ ان کا حسن و جمال دل لیوا، شوخی جانفزا موسیقی کی دھن، روح افزا تھی۔ نغمہ سرائی، ناز و ادا میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔''

(بنگال میں اردو، وفا راشدی 1955)

رامپور کے نواب کلب علی خاں نے 1866 میں ''میلہ بے نظیر'' کا اہتمام کیا تھا۔ کلکتے سے مارچ 1881 میں منّی بائی حجاب میلہ میں شرکت کرنے کے لیے رامپور گئی تھیں۔ داغ دہلوی پہلی نظر میں حجاب کے عشق میں گرفتار ہوگئے تھے۔ داغ نے حجاب سے پہلی ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے:

آفتِ جانِ ناتواں دیکھی — یک بیک مرگِ ناگہاں دیکھی
جلوہ دیکھا جو حور طلعت کا — سامنا ہوگیا قیامت کا
دیکھ کر اس پری شمائل کو — رہ گیا تھام تھام کر دل کو
دل کو میں ڈھونڈتا رہا نہ ملا — آنکھ ملتے ہی پھر پتہ نہ ملا
رنگ چہرے سے اڑ گیا کوسوں — دل سے میں مجھ سے دل جدا کوسوں
آبرو کا لحاظ و پاس کسے — ہوش میں آؤں یہ حواس کسے
یارو، غم خوار و مونس و ہمدم — کہہ رہے تھے تجھے خدا کی قسم
داغ تو ماجرا بیاں تو کر — تجھ کو کیا ہوگیا بیاں تو کر

(مثنوی فریاد داغ، مقدمہ: تمکین کاظمی، ص100، 1956)

داغ نے حجاب کا منظوم سراپا کس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے:

وہ اٹکتی ہوئی نظر آہا — وہ لچکتی ہوئی کمر، آہا
نشۂ حسن کی ترنگ غضب — نوجوانی کی تھی امنگ غضب

شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی — لن ترانی جواب میں کیسی
اُف رے عہد شباب کی ہستی — بے پیے ہے شراب کی مستی
ہائے تیرا کلام مستانہ — ہائے تیرا خرام مستانہ
گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا — اِدھر آنا اُدھر نکل جانا
حسن کی آن بان ہائے غضب — بے نیازی کی شان ہائے غضب
رقصِ طاؤس باغ سے اچھا — شعر کا لطف داغ سے اچھا
جس طرف اٹھ گئی وہ شوخ نگاہ — شور اٹھا کہ بس خدا کی پناہ

(ایضاً،ص:103-102)

حجاب جب کلکتہ واپس چلی گئی تو داغ کی بے قراری بڑھنے لگی اور وہ حجاب کو دوبارہ رام پور آنے کے لیے ضد کرتے ہیں ۔ کئی خطوط انھوں نے لکھے اور بے قراری جب حد سے تجاوز کر گئی تو داغ حجاب کی خاطر زہر کھانے کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے۔ داغ کے یہاں دو خط نقل کیے جاتے ہیں کیونکہ ان خطوط سے داغ کے سچے عشق اور داخلی کیفیات کا اندازہ ہوگا کہ وہ حجاب کو پانے کے لیے کس حد تک جا سکتے تھے۔

''دل دار و دل نواز!

کیا غضب ہے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی تمھاری نگاہیں پھر گئیں۔ وہ سب قول و قرار یک لخت فراموش کر دیئے، خط روانہ کیا تھا وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال، کیا میرے سینے میں دل نہیں یا دل میں تڑپ نہیں، کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا، کیا تلملانا میں نہیں جانتا، اس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو خود بازار جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دوں گا۔ تم سے وعدہ لیا تھا اور تم وعدہ کر کے گئی تھیں کہ روز نہیں تو ہفتے میں دو بار خط ضرور لکھا جائے گا۔ آج دس دن ہو گئے نہ خیر ہے نہ خبر اور کچھ اگر نہ لکھتیں تو خیریت رسی سے ہی اطلاع دے دیتیں، یہاں تو جس روز سے گئی ہو جان پر بنی ہے، کوئی بات اچھی نہیں لگتی، جب تک تمہارا خط نہ آئے دل کو کیسے چین آئے۔

تمھارا

داغ دہلوی 30 ستمبر 1879

(زبان داغ، مرتبہ: رفیق مارہروی، 1955، ص:186-185)

''بائی جی! سلام شوق

غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو، پاس ہوتیں تو سیر ہوتی، کبھی تمہارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالا بن جاتا، کبھی تمہیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہوجاتا کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہوجاتا۔ ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی کہ یہ دوسرا خط لکھوانے لگا، خدا کے واسطے جلد آؤ یا تاریخ آمد مقرر کر کے اطلاع دو، شب و روز انتظار میں گزرتے ہیں۔ وہاں کے لوگ کیوں کر خوشی سے اجازت دیں گے۔ تم ہی چاہوگی تو روانگی ہوسکے گی۔ میں تمہارے لیے بلبلا رہا ہوں۔ یہ خوفناک کالی راتیں اور تنہائی، کیا کہوں کیونکر تڑپ تڑپ کر صبح کی صورت دیکھتا ہوں ۔ یقین جانو ایسے تڑپتا ہوں جیسے بلبل قفس میں۔ میرے دونوں خطوں کے جواب آنا ضرور ہیں۔ فقط

تمھارا دلدادہ و منتظر

داغ

5 ستمبر 1880

(زبان داغ، مرتبہ: رفیق مارہروی 1955 ص:184)

منّی بائی حجاب دوبارہ مارچ 1882 میں ''میلہ بے نظیر'' میں شرکت کے لیے رام پور پہنچی اور ایک مہینہ رہنے کے بعد کلکتہ واپس لوٹ آئیں لیکن اس بار داغ کے دل و دماغ پر حجاب اس طرح چھائی کہ آخری دنوں تک وہ حجاب کو بھلا نہیں سکے۔ اس کا بین ثبوت داغ کے وہ خطوط ہیں انھوں نے حجاب کو لکھے تھے۔ ''زبان داغ'' میں ۱۱ خطوط شامل ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں داغ کی پہلی ملاقات سے آخری ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔

داغ دہلوی کے احساسات و جذبات حجاب کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے تو انھوں نے حجاب سے ملاقات کرنے کے لیے جون 1883 میں عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ کے مشہور محلے کولوٹولہ پہنچے۔ داغ کے لیے کلکتہ کا یہ پہلا سفر نہیں تھا کیونکہ وہ پہلی بار نواب رامپور کے ساتھ کلکتے کی سیر کر چکے تھے۔ غالب کی طرح وہ بھی کلکتے کی مدح سرائی کے بغیر نہ رہ سکے۔ کلکتہ کے متعلق داغ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سر بازار وہ مکان بلند — جس کو کہئے اک آسمان بلند
شوق بے اختیار لے ہی گیا — یہ دل بے قرار لے ہی گیا
آئی ایسی ہوائے کلکتہ — دل پکارا کہ ہائے کلکتہ
ریل پر دوستانِ نیک خصال — آئے اکثر برائے استقبال
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا — داغ آیا تو باغ باغ آیا

(مثنوی، فریادِ داغ، ص:134)

داغ کا قیام حجاب کے یہاں رہا۔ جب وہ کلکتے سے واپس

لوٹے تو وہ بھی غالب کی طرح اس شہر سے اپنے دلوں پر لاکھوں داغ لے کر چلے گئے:

یہ حسین یہ مہ جبین ، یہ شہر ایسی لہر بہر
داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پر لے چلے

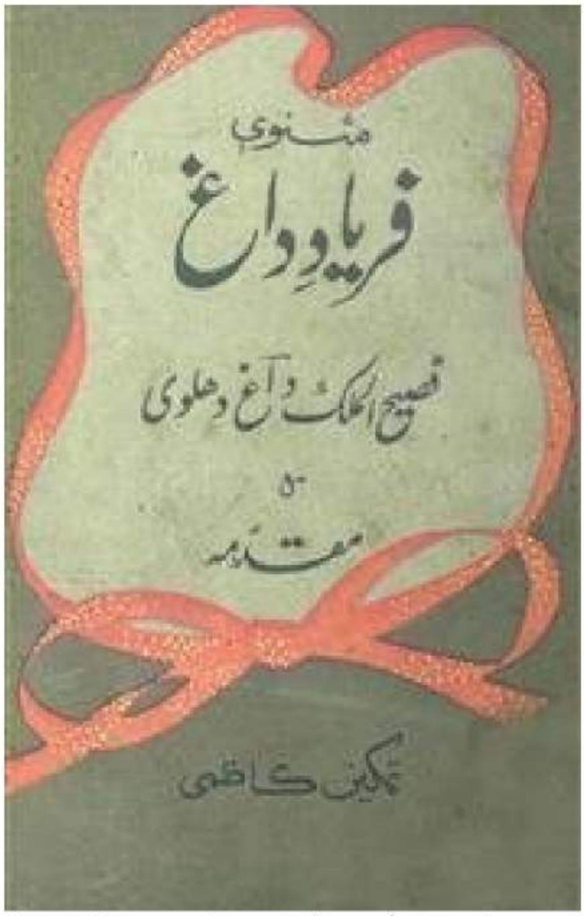

داغ نے اپنی عشق ومحبت کی روداد،''مثنوی فریاد داغ'' میں پیش کی ہے۔''مثنوی فریاد داغ'' 1883 میں صرف دو دنوں میں مکمل اور 1883 کو شائع ہوئی۔مثنوی کی پہلے ایڈیشن کی ایک مہینہ میں 1500 کاپیاں فروخت ہوگئی تھیں۔داغ دہلوی ''مثنوی فریاد داغ'' کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''مثنوی تمھاری تھی، تمہارے حال کی تھی، تمھاری صفات کی تھی، میں نے تو وہ حال واقعی موزوں کردیا ہے .... صاحب مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں، مہینہ بھر ہی میں فروخت ہوگئیں۔''

(زبان داغ، مرتبہ: رفیق مار ہروی 1955، ص: 189-190)

داغ دہلوی 3/جولائی 1883 کو کلکتے سے رامپور واپس چلے گئے تو حجاب نے اپنی ایک نصف تصویر داغ کو بھیجی تھی تو داغ نے اس تصویر کو دیکھ کر 5 رباعیاں لکھ کر حجاب کو بھیجی تھیں۔ یہاں وہ رباعیاں پیش کی جاتی ہیں:

❀

اس شکل کی دنیا میں نہیں کوئی نظیر
صورت ہے طبیعت کی طرح شوخ وشریر
اللہ رے، حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

❀

تم تو فلکِ حسن ہو ماہِ منیر
سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دلگیر
حالِ لبِ گلفام ہے شاہد اس کا
بے داغ نہ کھنچ سکی تمھاری تصویر

❀

ہر عیب سے خالی ہے تمھاری تصویر
دنیا سے نرالی ہے تمھاری تصویر
کس شکل مصور سے یہ پوری کھنچتی
دل کھینچنے والی ہے تمھاری تصویر

❀

کیا خوب مصور نے اتاری تصویر
دیکھی نہ سنی ایسی تو پیاری تصویر
جب ہاتھ لگاتا ہوں تو جی ڈرتا ہے
کہہ بیٹھے نہ کچھ منہ سے تمھاری تصویر

❀

دل لے کے مکرتی ہے تمھاری تصویر
یہ بات تو کرتی ہے تمھاری تصویر
خاموش جو ہوجاتی ہے اس کے آگے
کیا داغ سے ڈرتی ہے تمھاری تصویر

1883 کے بعد داغ دہلوی سے حجاب کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ان دونوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ داغ نے 24 سال تک نواب رامپور کلب علی خاں کے یہاں شان وشوکت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی اور اس کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ داغ حیدر آباد چلے گئے اور حجاب کو حیدر آباد بلانا چاہتے تھے۔انھوں نے

متعدد خطوط حجاب کو لکھے اس سلسلے میں انھوں نے نساخ ملکہ جان اور قاضی عبدالحمید سے منّی بائی حجاب کی شکایتوں کا ذکر کیا ہے اور حجاب نے ایک خط میں داغ کی شکایتوں کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا ہے:

''حاجی صاحب! السلام علیکم! بعد شوق ملاقات عرض پرداز ہوں کہ آپ کا محبت سے لبریز خط ملا، آپ بلائیں اور میں نہ آؤں، میری کیا مجال اور مجھ میں کہاں اتنی طاقت کہ غلط عذر کرسکوں مگر بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان جو چاہتا ہے وہ نہیں کرسکتا۔ میں لاکھ چاہتی ہوں کہ مجھے یہاں کے جھمیلوں سے نجات ملے اور میرے پر لگ جائیں اور آپ تک پہنچ لوں۔ مگر مجبوریوں کا خدا بھلا کرے کہ وہ ایسی روانگی میں حائل ہیں کہ کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی، آپ ہیں کہ برابر مجھے بے مروتی اور بے رحمی کے طعن وتشنیع سے چھلنی کیے ڈالتے ہیں، میرے ہر عذر کو بہانا خیال کر کے شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ واقعات جو ہیں، وہ من وعن میں خود اور حکیم صاحب آپ کو لکھ چکے ہیں۔ ان کا بار بار کیا ذکر کروں؟ آپ کی عقل کہاں گئی ہے؟ آپ کی ہوش مندی کدھر سو رہی ہے؟ سوچ سمجھ کر ضد کی جاتی ہے! اچھا صبر سے کام لیں وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ آپ میرے اور میں آپ کے سامنے موجود ہوں گی۔

آج دو روز سے مجھے زکام شدید ہوگیا ہے۔ ناک بری طرح بہتی ہے۔ یہ خط مشکل سے لکھ پایا ہے۔ یقین ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے، آپ نے یہ کیا لکھ دیا کہ بجز ''غمِ فراق'' کے سب خیریت ہے؟ مجھے آپ نے ایک دفعہ نہیں لکھا کہ یہ درد نقرس کے بار بار دورے کیا معنی رکھتے ہیں؟ حکیم صاحب والے خط سے مجھے معلوم ہوا، خدا کرے اب آپ بالکل صحیح ہوں، یہاں سب خیریت ہے اور پرسانِ حال سلام عرض کرتے ہیں۔ فقط

آپ کی منّی

17/جولائی 1901

(مثنوی فریاد داغ، مقدمہ: تمکین کاظمی، ص: 65-64)

منّی بائی حجاب 18 یا 19/جنوری 1902 میں حیدرآباد تشریف لائیں۔ داغ نے حجاب کو ساڑھے انیس سال بعد دیکھا تھا۔ داغ کے ساتھ دو سال گزارنے کے بعد 1903 میں حجاب واپس کلکتہ لوٹ گئیں۔ یہ داغ کا آخری زمانہ تھا لیکن حیدرآباد قیام کے دوران حجاب کے تعلقات داغ سے اچھے نہیں تھے۔ شاید اسی وجہ سے حجاب کلکتہ لوٹ آئیں۔ اس سلسلے میں رفیق مارہروی لکھتے ہیں:

''داغ کا یہ آخری زمانہ تھا، عمر کے ساتھ جذبات بھی سرد ہوچکے تھے، حسن پرستی فطرت ثانیہ تھی لہٰذا اس آخر زمانے میں ارباب نشاط کی وابستگی بجز وضعداری کے اور کچھ نہ تھی، بعض حالات کی بنا پر اس وضعداری بھی فرق آیا اور حجاب سے تعلقات خراب ہوگئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ 1904 میں بی حجاب کلکتہ واپس چلی گئیں۔''

(زبان داغ، مرتبہ: رفیق مارہروی، ص: 1955/181)

حجاب سے داغ کی آخری ملاقات تھی کیونکہ ایک سال کے بعد 15 فروری میں داغ کا انتقال ہوگیا تھا اور منّی بائی حجاب نے بھی گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔

''مثنوی فریاد داغ'' کے علاوہ ''آفتاب داغ'' اور ''دیوان داغ'' میں حجاب کا ذکر ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

در پردہ تم جلاؤ، جلاؤں نہ میں چہ خوش
میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

❁

تم میں یہ وصف ہے کہ ہو بے داغ
مجھ میں یہ عیب بے حجاب ہوں میں

❁

دیکھ کر جلوہ غش ہوئے موسیٰ
داغ مجھ کو حجاب نے مارا

❁

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
اے داغ، کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

حجاب طوائف کے ساتھ ساتھ ایک صاحب دیوان شاعرہ بھی تھیں۔ مختلف تذکروں میں ان کے دیوان کا ذکر ملتا ہے لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی ان کا دیوان راقم کو نہیں ملا۔ اس سلسلے میں ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، نیشنل لائبریری، کلکتہ، خدابخش لائبریری، پٹنہ اور رام پور رضا لائبریری میں بھی تلاش کیا لیکن دیوان کا کچھ سراغ نہیں ملا۔ حجاب کے ہم عصروں میں ملکہ جان، مشتری، زہرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رفیق مارہروی نے ایک مضمون ''نگار''، لکھنؤ کے لیے اگست 1948 میں تحریر کیا ہے کہ حجاب فیض داغ سے شاعرہ ہوئیں یا پہلے سے شعر کہا کرتی تھیں لیکن مختلف تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ حجاب کی شاعری فطری تھی وہ داغ سے ملاقات سے پہلے شعر کہا کرتی تھیں۔ وفا راشدی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''مرزا داغ اردو کے سب سے زیادہ کثیر التلامذہ استاد سخن تھے۔ برصغیر کے گوشے گوشے میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ پورے ہندوستان میں ان کی استادی کا طوطی بول رہا تھا۔ دور دور تک ان کی شہرت تھی جس کی کوئی حد نہ تھی۔ علامہ اقبال سیالکوٹی اور علامہ سیماب اکبرآبادی جیسے اکابر و مشاہیر داغ کے شرف تلمذ پر فخر کرتے تھے۔ داغ کے اس مقام و مرتبہ کے باوجود حجاب نے داغ سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔''

(کلکتے کی ادبی داستانیں، وفا راشدی، ص:158)

حجاب، عبدالغفور نساخ کے شاگرد مولوی عصمت اللہ انسخ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتی تھی لیکن ''تذکرہ بہارستان'' اور ''تذکرۃ النساء'' میں حجاب کو شوکت علی کی شاگرد بتایا گیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ نساخ کے کہنے پر حجاب نے انسخ سے اپنے کلام پر باقاعدہ اصلاح لینا شروع کی تھی۔ اس قول کی توثیق درج ذیل اقتباسات سے ہوتی ہے:

''حجاب مولوی عصمت اللہ صاحب، جو پہلے ''مہجور'' بعد میں ''انسخ'' تخلص کرتے تھے۔ نساخ کے شاگرد تھے۔ قصبہ پنڈوہ ضلع ہگلی، نواح کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ حجاب کے شعروں پر اصلاح کرتے تھے۔ شاعرہ کلکتے میں رہتی تھی۔ وہ رام پور اور حیدرآباد بھی گئی۔''

(تذکرۃ الخواتین، مولوی عبدالباری آسی 1927، ص:52-53)

''منی بائی عرف منجھلی خوش باش، کلکتہ 1286 ہجری کے پس و پیش میں عصمت اللہ انسخ سے اصلاح لیتی تھی۔''

(تذکرۂ مشاہیر نسواں، محمد عباس، 1902، ص:219)

فصیح الدین بلخی لکھتے ہیں:

''1286 ہجری مطابق 1872 کے لگ بھگ حجاب مولوی عصمت اللہ انسخ سے اصلاح سخن لیتی تھی۔''

(تذکرۂ نسوان ہند، فصیح الدین بلخی، 1956، ص:75)

حجاب کا کچھ کلام تذکروں میں موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حجاب کا کلام خالص عشق مجازی کے گرد طواف کرتا ہے کیونکہ وہ ایک طوائف تھی اس لیے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار اپنی محفلوں میں کرتی تھیں۔ ان کے کلام پر داغ کا رنگ غالب ہے۔ بقول وفا راشدی:

''حجاب کی شاعری میں وہی رنگ و آہنگ، وہی آن بان اور آب و تاب ہے جو داغ کے افکار کی خصوصیات ہیں۔ کیوں نہ ہو آخر زندہ عاشق و معشوق کے سچے عشق کے گہرے جذبات و احساسات ان کی داخلی کیفیات و محسوسات کے مظہر ہیں۔ ایک ایک شعر نہایت صاف، برجستہ، سادگی اور پُرکاری سے مرصع ہیں۔ زبان ایسی دلپذیر کہ کلام حجاب پر زبان داغ کا گمان ہوتا ہے۔''

(کلکتے کی ادبی داستانیں، وفا راشدی۔ ص:159)

حجاب کا دیوان دستیاب نہیں ہے تو تذکروں میں جو کلام ملا اسے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے:

عدو کے کہنے سے مجھ کو ذلیل و خوار کیا
سزا یہ اس کی ہے میں نے جو تم کو پیار کیا

برا کیا جو کہا ان سے مدعا دل کا
غضب کیا جو محبت کو آشکار کیا
کہوں گا داورِ محشر کے آگے حشر میں یہ
کہ عمر بھر اسی کافر کو میں نے پیار کیا

ہم اور پیچ میں آتے ہیں ان کی باتوں کے
انھوں نے وعدہ کیا ہم نے اعتبار کیا

سزا یہی ہے کہ طرفین میں ہو بے چینی
مرے تڑپنے نے ان کو بھی بے قرار کیا

بتا تو چرخ بھلا اس سے تجھ کو کیا حاصل
کسی کا شیوۂ ذاتی جو اختیار کیا

ایک دم بھی کسی کروٹ نہیں ملتا آرام
ہائے بے چین ہیں ہم درد جگر سے کیا کیا

❁

حال حجاب قابل شرح بیاں نہیں

آنسو نہ ٹپکے سن کے یہ وہ داستان نہیں
دل میں جگر میں سینے میں پہلو میں آنکھ میں
اے عشق تیری شعلہ فشانی کہاں نہیں
دیتے ہیں چھیڑ چھیڑ کے کیوں تجھ کو گالیاں
سمجھے ہوئے ہیں وہ مری شیریں زباں نہیں
پوچھو نہ حال زار مرا تم سے کیا کہوں
گم کردہ راہ باغ ہوں بادآشیاں نہیں
وہ اور میرے گھر میں چلے آئیں خود بخود
سر پر مرے حجاب مگر آسماں نہیں

گلستاں میں آج بہر سیر یار آنے کو ہے
مژدہ باد اے بلبلو فصل بہار آنے کو ہے
دھوم ہے گھر میں ہمارے یاد آتا ہے حجاب
بہر استقبال لب پر جان زار آنے کو ہے

کیا تماشا ہے کہ لے کر آئینہ کو ہاتھ میں
دیکھ کر زلفیں وہ اپنی آپ بل کھانے لگے
پھر تصور کا کل جاناں کا مجھ کو آگیا
سینۂ محزوں پہ پھر دو سانپ لہرانے لگے
شوخ ہو، بے باک ہو، سفاک ہو، چالاک ہو
کیوں شب وصلت میں مجھ سے آپ شرمانے لگے

تلخئ ہجر بتان زہر سے بدتر ہی سہی
تم وہاں غیر سے ہو شیر و شکر وصل کی رات
اے حجاب ان کو غرور اور ہمیں بات کا پاس
عیش و آرام ادھر تھا نہ ادھر وصل کی رات

ان سے کہہ دو کہ ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی
وعدہ ہم سے ہو، رہو غیر کے گھر وصل کی رات

رقیب نے اسے رسوا کیا سرِ محفل
غضب یہ ہے کہ اس پر بھی شرمسار کیا

ان روزوں ان کو اور کسی کا خیال ہے
ورنہ عدو کو اور مجھے کیوں ملال ہے
جب سے سنا ہے ایک وفات وصال ہے
مرنے کی وہ خوشی ہے کہ جینا محال ہے
چھپنا نہیں ہے لاکھ طرح سے چھپائیں وہ
مضمون وصلِ عید بھی عاشق کا حال ہے
ذکر عدو نہ کرتے ، نہ ہوتے وہ آب آب
مجھ کو حجاب ان سے بڑا انفعال ہے

ہماری نعش کو ٹھوکر لگاکے اس نے کہا
ہمارے آنے کا کیا خوب انتظار کیا
برا کیا جو کہا ان سے مدعا دل کا
غضب کیا جو محبت کو آشکا رکیا

ہجو ہے اور میرے آگے واہ رے لطفِ بیاں
نصرت واعظ اتر آئیں ذرا منبر سے آپ

بہار آئی ہے سامان چمن بندی ہے گلشن میں
شفق پھولی ہے عکس گل سے نظارے کے دامن میں

مرگ دشمن کا سوگ اس نے رکھا
میں پشیماں ہوں خود دعا کرکے

حضرت ناصح نہ بک بک کر پھرائیں سر مرا
قبلۂ من چپ ہی رہیے بس نصیحت ہوچکی

□□□

Mr. Md. Shahid
7/A, Jodhan Singh Road
P.O.Rishra
Distt. Hooghly-712248 (W.B)
Mob:9831365009/7980672722

عائشہ صدیقہ جے

تمل ناڈو میں اردو لوک گیت

لوک ادب سے مراد وہ ادب جس کو عوام نے جنم دیا ہو۔ کوچہ وبازار میں، قریہ اور دیہات میں، اور کھیت کھلیانوں میں جو لوک ادب پروان چڑھتا ہے عام طور پر اس کا جنم داتا کوئی ایک شخص نہیں ہوتا بلکہ پورا معاشرہ ہوتا ہے۔ لوک ادب کے منظرنامے پر نگاہ ڈالیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ اس کی روایت انتہائی توانا اور اس کی حدیں نہایت وسیع رہی ہیں۔ عورت اور مرد کے رشتے سے پیدا ہونے والے مختلف مراحل ومسائل لوک گیتوں کا موضوع رہے ہیں۔ بچے کی پیدائش سے جڑے مختلف رسوم کی ادائیگی، ہجر ووصال کی کیفیت کا بیان، اخلاقیات کا درس، عوام کی امنگیں اور آرزوؤں کا بیان لوک گیتوں میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں، اردو لوک گیتوں کا ایک بڑا حصہ شادی بیاہ کے گیتوں پر بھی مشتمل ہے۔ اردو میں عوامی ادب یا لوک ادب، لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی شکل میں ملتا ہے۔ وہ بڑی حد تک ان عوامی آثار کی بازیافت ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہے۔ یہ لوک گیت اگرچہ اجتماعی ذہن کی پیداوار ہیں، لیکن ان کی تخلیق انفرادی سطح پر بھی ہوئی ہے۔ ان گیتوں کے سوتے دلوں سے پھوٹے ہیں۔ اجتماعی خوشیاں اور اجتماعی غم کی تصویریں لوک گیتوں کا حصہ رہی ہیں۔ یہ لوک گیت بڑی حد تک ہمارے فکری احساسات وجذبات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ لوک ادب کا ایک بڑا سرمایہ ماضی کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ لیکن ان تصویروں کی بازیافت کے بغیر حال کا نہ کوئی خاکہ بن سکے گا اور نہ ہی اسے کسی روایات سے وابستہ کیا جاسکے گا۔

لوک گیتوں کی روایات سے متعلق چند تمہیدی کلمات کے ساتھ میں اپنے اصل موضوع کا رخ کرتی ہوں۔ لوک گیتوں کو جس طرح ہندوستان کے طول وعرض میں ہماری خواتین نے اپنے سماجی کام کاج کے موقعے پر چاہے وہ شادی بیاہ کا موقعہ ہو، یا بچوں کی ولادت کی خوشیاں ہوں، یا عید برات کا موقعہ ہو، یا مولود شریف وقرآن خوانی کی محفلیں ہوں، لوک گیت گا کر اپنی حصہ داری وشرکت کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح صوبہ تمل ناڈو کی خواتین بھی لوک گیتوں کے حوالے سے پیچھے نہیں رہیں، بلکہ اس میدان میں وہ اپنے وجود کا احساس دلاتی رہیں۔ میں نے اپنے اس مقالے کو تمل ناڈو کے صرف پانچ شہروں میں رائج لوک گیتوں تک محدود رکھا ہے۔ جن میں کرشنگری، ترپاتور، آمبور، سیلم اور کوئمبتور شامل ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جو لوک گیت سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچے ہیں وہ بیشتر عوامی سطح یا ناخواندہ خواتین کی زبان ہی سے ادا ہوئے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم ان لوک گیتوں کو محفوظ کرتے اور کتابی شکل دیتے، لیکن اس کی طرف ہمارے دانشوروں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس لیے لوک گیتوں کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہونے سے رہ گیا۔ لوک گیتوں کی حفاظت نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے لوک گیتوں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ خالص عوامی زبان ہے جسے ہماری خواتین اپنے روز مرہ میں استعمال کرتی ہیں۔ ہمارے دانشوروں کو چونکہ اس میں کوئی خاص ادبی اہمیت کا پہلو نظر نہیں آیا اس لیے یہ گیت ہر دور میں نظر التفات سے

محروم رہے۔ ویسے بھی تمل ناڈو میں جن لوک گیتوں کا ذخیرہ دستیاب ہے، وہ بیشتر دکنی زبان میں ہی ہے جو یہاں کے اردو والوں کی عوامی بولی ہے۔

کرشنگری، تمل ناڈو کا ایک قدیم شہر ہے جہاں اردو بولنے والے تقریباً ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے سے سکونت پزیر ہیں۔ یہ شہر اپنی تہذیبی قدروں کے اعتبار سے بھی خاص پہچان رکھتا ہے۔ مختار بدری، عثمان فہمی اور منیر رشیدی جیسے باکمال شعراء کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ کرشنگری کے علاقے میں شادی بیاہ کے موقع پر دلہن کے قریبی رشتہ دار کس طرح اپنا رول ادا کرتے ہیں اس کی تصویر کشی لوک گیت کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔ شادی کے دن دلہن کو پھوپیاں اور خالہ مائیں کس طرح اسے سنوارتی سنگارتی ہیں ملاحظہ کیجیے :

اُجالے کے پارے چوڑیاں گھگائیں
لاڈلی بھتیجی کو پھوپیاں پھول بنائیں

لمبے لمبے بال نانا۔۔نانی پالے
جا فل کے جھاڑ تلے خالہ چوٹی ڈالے

اجالے کے پارے آسمان بھر کو تارے
بھئی تیری شادی کو ایسی ساڑی لارے

یہاں آپ نے غور کیا ہوگا کہ پھوپی، خالہ اور بھائی اپنا اپنا کردار نبھا کر دلہن کا دل جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ نانا، نانی اپنی نواسی کے بالوں کی پرورش میں کتنا دھیان رکھتے تھے۔ آج یہ تصور ہمارے سماج سے ختم ہوگیا ہے۔ نواسی کے بالوں کو پالنا تو دور کی بات نواسی کے لیے خیر کی بات کرنا بھی ناپید ہوگیا ہے۔

ترپاتور، کرشنگری سے کچھ ہی دوری پر آباد ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں کے مسلمان تمل اور اردو دونوں زبانیں بولتے ہیں جو اردو بولنے والے مسلمان ہیں وہ اپنے گھروں میں دکنی بولتے ہیں۔ یہاں جو دکنی بولی جاتی ہے وہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ وہی ہے جو مدراس، بنگلور، کرنول وغیرہ کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ البتہ لہجے کے فرق سے ترپاتور کی دکنی اردو اپنی علٰحیدہ پہچان رکھتی ہے۔

شادی کے لیے لڑکی کی جستجو کرنا ہر دور میں ہر گھرانے کی ریت رہی ہے۔ آج بھی لڑکی کی تلاش میں لڑکے والے کوئی بھی کثر باقی نہیں رکھتے البتہ لڑکی کے انتخاب کے بارے میں والدین کی سوچ بدل گئی ہے۔ آج کے بیشتر والدین چاہتے ہیں کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو، کام کرنے والی ہو اور مالدار گھرانے کی ہو، جبکہ آج سے پچاس، ساٹھ سال پہلے والدین کی سوچ کیا تھی اور وہ کس طرح کی لڑکی کو پسند کرتے تھے اس کا اندازہ اس لوک گیت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو شہر ترپاتور کے لوک گیتوں کے ذخیرے سے دستیاب ہوا ہے۔ ملاحظہ ہوں :

چھوکری پھول میں پھول دِسنا جی
بھولی صورت قبول دِسنا جی

بہو کو دیکھے تو پھول مرجانا
پیاسی آنکھوں کی پیاس مرجانا

لٹکے چوٹیاں تو ناگ ڈر جانا
بیٹی دنیا میں نام کر جانا

ہنڈیاں دھونے کی اُس کو عادت ہو
سارے گھر بار کو کھلا دے کر
بُھکا سونے کی اس کو عادت ہو

پا ک سیتا ہو سچی مائی ہو
پورے اللہ میاں کی گائی ہو

یہاں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس وقت روپے پیسے اور جوڑے گھوڑے کی بجائے لڑکی کے چہرے مُہرے اور بالوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اس وقت لڑکی پڑھی لکھی ہونے کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس کے برعکس یہ دیکھا جاتا تھا کہ لڑکی ہانڈی برتن دھونے میں کس قدر مہارت رکھتی ہے اور اس میں قوتِ برداشت یعنی بھوکا پیٹ سونے کی عادت کتنی ہے۔ غرض آج والدین کی سوچ کس قدر بدل گئی ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں مذکورہ بالا لوک گیت سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ہم یہ بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ اس دور میں خانگی زندگیاں بہت کم ایسی ہوں گی جسے ناکام کہا جاسکتا ہے۔ جبکہ آج کے ترقی یافتہ دور میں شادی کے فوراً بعد پڑھے لکھے جوڑوں کے درمیان جو نفرتیں اور دوریاں پیدا ہوتی ہیں اس کے اسباب کیا ہیں اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

آمبور ضلع ویلور کا ایک صنعتی شہر ہے۔ یہ شہر عربی مدرسوں کے لیے جانا پہچانا جاتا ہے۔ آمبور سے کچھ ہی فاصلے پر واقع دَرسگاہ دارالسلام عمرآباد دینی علوم کی تعلیم کے لیے دنیا بھر میں اپنی پہچان رکھتا ہے۔ آمبور

میں اردو بولنے والوں کی ایک قابل لحاظ آبادی موجود ہے۔اگر چہ یہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان دکنی ہے لیکن اردو کے بڑے بڑے ادیبوں و شاعروں کا تعلق آمبور سے رہا ہے۔جیسے: مقبول آمبوری، فہیم آمبوری، دانش فرازی، کاوش بدری، علی اکبر آمبوری وغیرہ۔شادی بیاہ کے موقعوں پر لڑکی اور لڑکے والے اور ان کے رشتہ دار ایک دوسرے کو طنز و ملامت کا نشانہ بناتے ہیں یہ طنز صرف وقتی ہوتا ہے جیسا کہ غالب نے کہا تھا کہ:'' دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے''۔طنز کے یہ تیر و نشتر چونکہ زیادہ گہرے نہیں ہوتے اس لیے تھوڑی دیر کے لیے گھرانوں میں دلچسپیوں اور خوشیوں کے سامان مہیا کرنے کے لیے برسائے جاتے ہیں۔شادی کے بعد دلہا اور دلہن اپنی اپنی ساسوں کے تحفوں پر کس طرح طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے، جو آمبور کے لوک گیتوں کا حصہ ہے۔گیت کے بول ملاحظہ کیجیے :

لڑکا کہتا ہے :

دلہن میری شمع، دلہا ہے پروانہ
ساس نے جو جوڑا بھیجا کیسا ہے پرانہ
پہنے گی دلہن تو ہنسے گا زمانہ

لڑکی جواب دیتی ہے :

اماں نے جو جوڑا بھیجا کیسا ہے شاہانہ
پہنے گی دلہن تو دیکھے گا زمانہ
دلہن میری شمع، دلہا ہے پروانہ

پھر لڑکا کہتا ہے :

ساس نے جو زیور بھیجا کیسا ہے پرانا
پہنے گی دلہن تو ہنسے گا زمانہ
دلہن میری شمع، دلہا ہے پروانہ

یہاں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس گیت کے بول نہات صاف شستہ و رواں زبان میں کہے گئے ہیں۔کرشنگری اور ترپاتور کے مقابلے میں آمبور کے خواتین و حضرات پر شستہ زبان کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں، تو غلط نہ ہوگا کہ آمبور کے عوامی گیتوں میں بھی ایک طرح سے شستہ و رواں زبان دیکھی جاسکتی ہے جو اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آمبور کے وہ باذوق گھرانے ہیں جن کی گھٹی میں اردو پڑی ہوئی ہے۔
سیلم تمل ناڈو کا ایک خوبصورت شہر ہے۔یہاں کے مسلمانوں کی مادری زبان تمل اور دکنی ہے جو گھرانے دکنی زبان بولتے ہیں ان کی زبان پر بھی تمل کے اچھے خاصے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔یہ علاقہ کبھی اردو کا مرکز نہیں رہا، اس لیے تمل ناڈو میں اردو کی تاریخ میں اس کی شمولیت کسی بھی زاویے سے نظر نہیں آتی، البتہ لوک گیتوں کی روایت یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آمبور اور وانمباڑی کے جن خاندانوں نے روزگار کی تلاش میں یہاں ہجرت کی تھی ان گھرانوں میں آج بھی دکنی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔شادی بیاہ سے تعلق رکھنے والے لوک گیتوں کے بول جو آج بھی سیلم میں مقیم، دکنی گھرانوں میں گنگنائے جاتے ہیں۔اپنے بھائی سے متعلق ایک بہن کے تاثرات و خواہشات کو آپ اس گیت میں محسوس کر سکتے ہیں۔گیت ملاحظہ ہو:

بسم اللہ میں بول کر بات کریوں شادی کی
آمین بولو بھائی مبارک جوڑے کی

شب گشت نکلے بھائی حُسینی گھوڑے پو
وہ گھوڑا چمکے گا سلطانی سیرے پو

بھائی جی، بھاوج کیا کرتیں معلوم نئی
سُینے کی سوئی لے کر زَر بھرتیں شالوں میں

عارس ، دیکھو کیوں سوتیں کروٹ
تیرے نوشو آکو کھڑیں جلدی اُٹھ کر بیٹھ

ہماری جی بھاوج کریلے پکائی
ہمیں نندان گئے تو محلے محلے چھپئی

میں اب کوئمبتور کی طرف آتی ہوں۔اسی طرح کا ایک اور لوک گیت جو کوئمبتور کے لوک ادب کا حصہ ہے آپ کی توجہ کی نذر کر رہی ہوں اس گیت میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، کہ شادی کے بعد شوہر نام دار کی محبت نے لڑکی کے دل پر ایسے نقش چھوڑے ہیں کہ وہ اپنے خاص رشتے داروں کی پیش کش کو بھی ٹھکرا دیتی ہے۔گیت کا یہ منظر ملاحظہ کیجیے :

''برفی کا بنگلہ ۔۔۔جلیبی کی کھڑکی''
ساس آئی بلانے، گلسر لائی پنانے
میں نئی آتی ماں ۔۔۔میں نئی آتی ماں

سسرے آئے بلانے، چھتری لائے مارنے
میں نئی آتی ماں ۔۔۔ میں نئی آتی ماں

دیور آیا بلانے ، زیور لایا پنانے
میں نئی آتی ماں۔۔۔ میں نئی آتی ماں

نند آئی بلانے، سُیاں لائی چُبانے
میں نئی آتی ماں۔۔۔ میں نئی آتی ماں

دُلہا آیا بلانے، اسکوٹر لایا بٹھانے
میں جاتیوں ماں۔۔۔میں جاتیوں ماں

میں نے اپنے مقالے مین جن لوک گیتوں کا تذکرہ کیا ہے بھلے وہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں اُن کے گیت کار نہ شاعر ہیں نہ شاعرات بلکہ وہ گھریلو عورتیں ہیں جو شادی بیاہ، تہواروں، عید براتوں اور میلے کھیلوں کے موقع پر تُک بندی کر لیتی ہیں اور اِن گیتوں کو اپنی ہی آواز سے مزین بھی کرتی ہیں، یہ گیت ہمارے سماج کا وہ شفاف آئینہ ہے جن میں اردو بولنے والے عوام کی روح رقص کرتی نظر آتی ہے۔

□□□

Ayesha Siddiqua J
163/ 72
N.S.K Street
Old Pet,
Krishnagiri - 635001(Tamilnadu)
E-mail:ayeshadoulath555@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

صبانوشاد

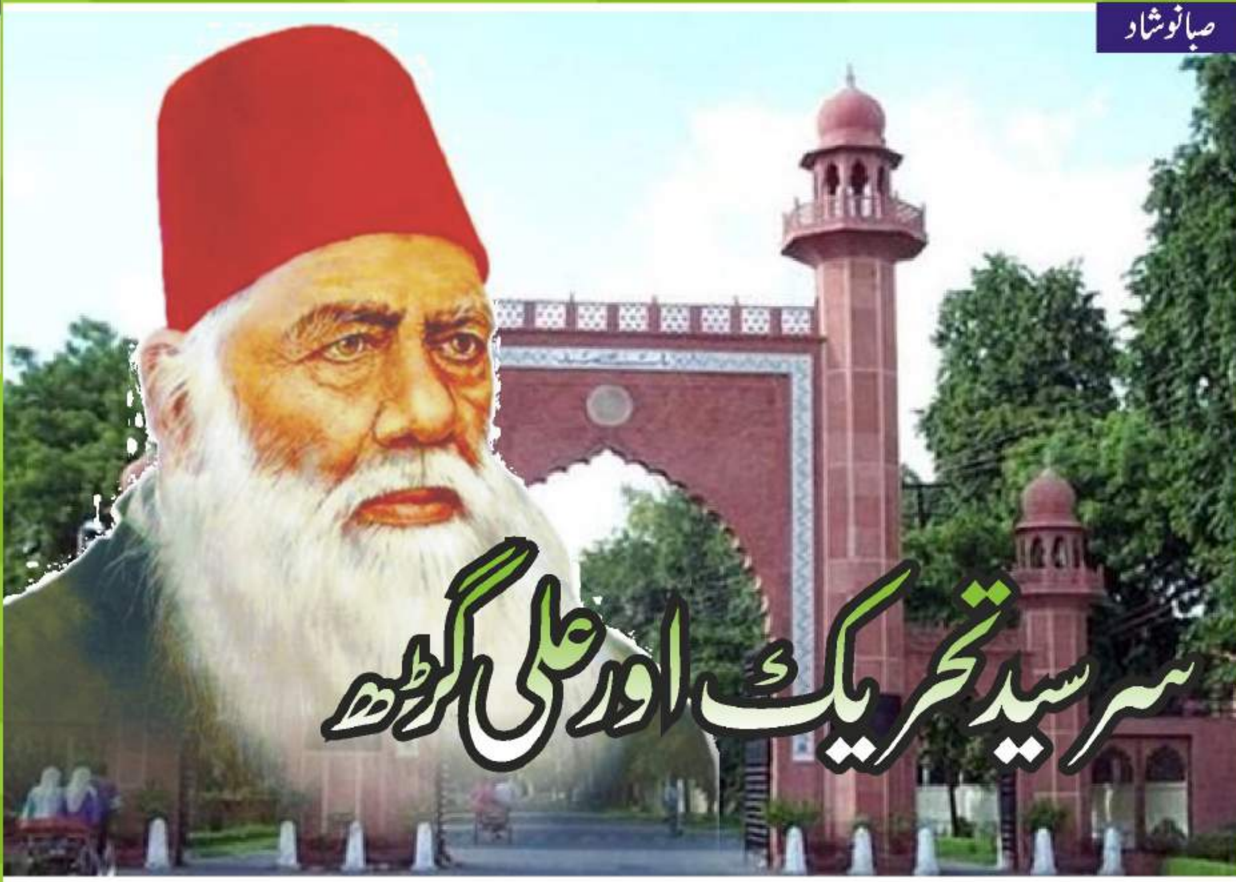

سر سید تحریک اور علی گڑھ

انیسویں صدی کے تاریخی تناظر میں جن عظیم المرتبت شخصیات نے جنم لیاان ہی میں سید احمد خاں منارۂ نور کی شکل میں رونما ہوئے۔ سر سید احمد خاں ایک نابغہ روز گار اور کثیر الجہات دانشور مفکر، مصلح مفسر قرآن اور تعلیمی نظریہ ساز کے طور پر منفرد مقام کے متحمل ہیں۔ موصوف کی حیات وخدمات پر لکھنے کا سلسلہ ہر عہد اور ہر دور کے قلم کاروں کا محبوب موضوع رہا ہے۔

اس موقع پر شبلی نعمانی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
ان کی جو بات تھی آور دتھی، آمد تو نہ تھی

ہندوستان میں اگر چہ متعدد ادبی تحریکیں اور رجحانات جنم لیتے رہے۔ انھیں میں ترقی پسند تحریک، رومانی تحریک اور دلی کالج بھی قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن علی گڑھ تحریک کو جو مقصدیت اور امتیاز حاصل ہے وہ کسی اور تحریک کو میسر نہیں آیا۔ اس تحریک کے محرک اول اور روح رواں انیسویں صدی کے عظیم مفکر اور دانشور سر سید احمد خاں تھے۔ سر سید بنیادی طور پر تعلیمی نظریہ ساز تھے۔ باقی ماندہ کاوشیں ان کی شخصیت کے ذیلی عکس قرار پائے۔

علی گڑھ تحریک کے متعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سیّد حامد اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

> ”علی گڑھ تحریک اعتماد کی بازیابی کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ ہندوستانی مسلمان مٹی کے ڈلے کی طرح زمین کے سینہ پر بوجھ بننے کی بجائے باخبر اور حوصلہ مند شہری بنیں۔ زمانے سے خائف اور نفور ہونے کے بجائے وہ زمانے سے صحتمندانہ ہم آہنگ ہوں۔ اپنے درخشاں ماضی پر وہ فخر ضرور کریں لیکن اس فخر کو حرکت کا ذریعہ بنائیں، نیند لانے والی دوا نہیں اور ہمّت اور اتحاد کے ساتھ وہ کام کریں جس سے حال سنور جائے اور مستقبل بکھر جائے۔“

(علی گڑھ تحریک، سیّد حامد ص6)

انیسویں صدی عیسوی کا دور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ناکامی اور مایوسیوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ 1857 کے غدر کی ناکامی نے مسلمانوں کو ذہنی انتشار، معاشی بدحالی، اور سستی و کاہلی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ویسے تو اس بغاوت نے ہندوستان کے سبھی طبقات کو متاثر کیا تھا اور کوئی طبقہ اس کے اثرات سے خالی نہ تھا، لیکن مسلمان اس تحریک میں پیش پیش

تھے۔اس لیے اس غدر کے اثرات کا شکار مسلمانوں کو ہی زیادہ ہونا پڑا، کیونکہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ اس بغاوت کی قیادت مسلمانوں نے کی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتوے اور علماء کی بھاگ دوڑ نے انگریزوں کے دلوں پر یہ نقش کر دیا تھا کہ مسلم قوم کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے نفرت پھیلانے کا کام یہی علماء کر رہے ہیں۔انگریزوں کے اسی یقین نے مسلمانانِ ہند کی طرف سے مزید تقویت کو جنم دیا اور انگریزوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ اذیت دینا شروع کر دیا۔

سرسید ان چیزوں کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔وہ چاہتے تو اس ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے اور اپنی زندگی عیش و آرام سے بسر کرتے لیکن سرسید کی خودداری نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر جائیں وہ دن رات اپنی قوم کو بچانے کی فکر میں لگے رہتے مگر کوئی طریقہ کار نظر نہیں آتا تھا۔چونکہ اب سرسید یہ سمجھ چکے تھے کہ جدید تعلیم حاصل کیے بغیر انگریزوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا،اس وقت مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں۔ان میں سے ایک اہم تحریک سرسید کی علی گڑھ تھی ،یہ تحریک جو علی گڑھ تحریک کے نام سے منسوب ہے۔اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی جو چالیس پچاس سال تک پورے زور و شور کے ساتھ ہندوستان میں جاری و ساری رہی۔

سرسید اپنی قوم کی حالت پر متفکر ہو کر کہتے ہیں:

”اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔مشکل تو یہ ہے کہ قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے تکبر اور غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے، دین و دنیا میں بکار آمد نہیں غلط اور بے اصول باتوں کی پیروی کرنا، بے اصل اور اپنے آپ پیدا کیے ہوئے خیالات کو امور واقعی اور حقیقی سمجھ لینا اور ان پر فرضی بحثیں بڑھائے جانا اور دوسروں کی بات کو خواں کیسی ہی سچی کیوں نہ ہو ، نہ ماننا اور لفظی بحثوں پر علم و فضیلت کا دارومدار ان کا شیوہ تھا۔“ (لیکچرس سرسید احمد خاں ص 41)

برصغیر اور خصوصاً ہندوپاکستان کے مسلمانوں میں 1857 کی ناکامی کے بعد نشاۃ الثانیہ کی تحریک کا آغاز سرسید کے ذریعہ ہوا۔جس نے پس ماندہ مسلم معاشرے کو دور جدید کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنا کر صحیح سمت کی جانب گامزن ہونے کے لیے رہنمائی کی۔

سرسید کی یہ تحریک ویسے تو مسلمانوں کی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر اثر انداز ہوئی اور اس کی بدولت مختلف شعبوں میں انقلاب پیدا ہوا خاص طور پر سماجی اور ادبی میدان میں لیکن اس کے علاوہ اس تحریک کے پانچ مختلف پہلو اور بھی تھے۔تعلیم، سیاست، مذہب، ادب اور معاشرت۔

تعلیم کی ضرورت پر سرسید بہت زور دیتے تھے ،انھیں تعلیم سے محرومی قوم کی بدحالی کا سب سے بڑا سبب معلوم ہوتا تھا۔وہ جدید مغربی تعلیم کو ضرورت کا تقاضا سمجھتے تھے اور قدیم مشرقی تعلیم کو اس زمانے کے لیے بیکار اور مضر خیال کرتے تھے۔سرسید کی جدید تعلیم کی عمدہ مثال تہذیب الاخلاق، سائنٹفک سوسائٹی، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ،محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس وغیرہ ہیں۔

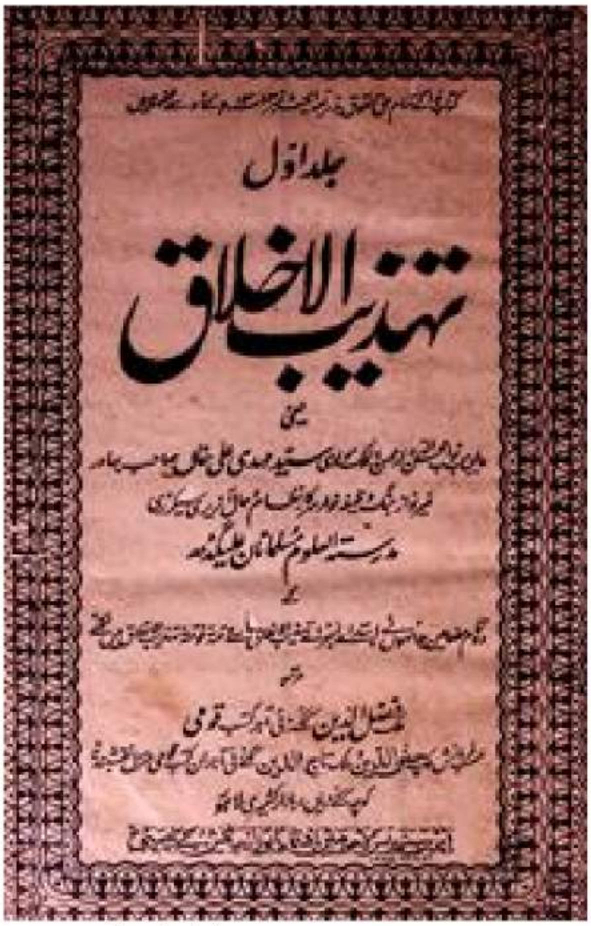
جلد اول

تہذیب الاخلاق

یعنی

تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے سے پانچ سال قبل 24 دسمبر 1870 کو شائع ہوا تھا۔پہلے شمارہ میں سرسید احمد خاں نے اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل لفظوں میں واضح کر دیے تھے۔

”.........بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم

میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں، ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں، ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلاویں۔''

جدید تعلیم کو عام کرنے کے لیے سرسید نے تعلیم کے میدان میں سہ طرفی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو قائم کیا۔

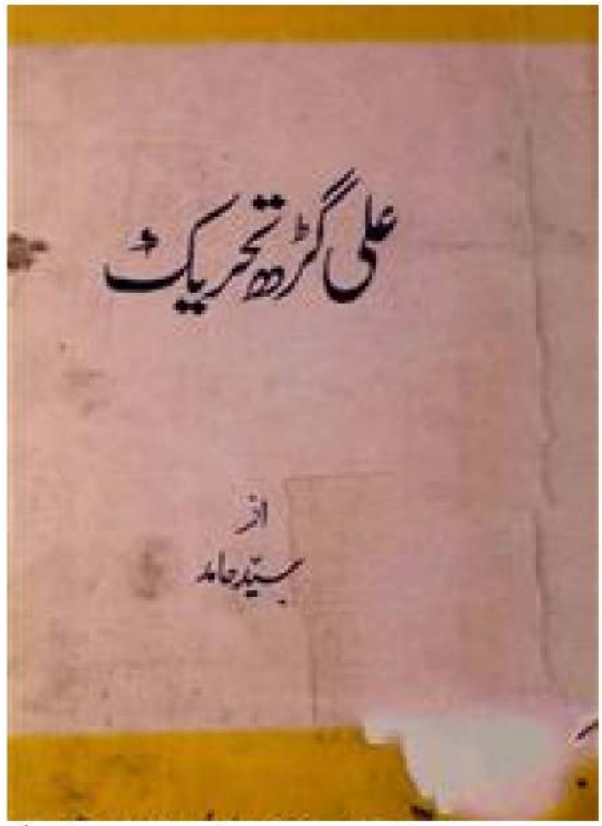

سائنٹفک سوسائٹی 9 جنوری 1863 کو غازی پور میں قائم ہوئی اور 1864 میں یہ علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ سرسید کا تعلیم کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ تعلیم وہی بہتر ہے جو مادری زبان میں دی جائے۔ 1867 میں انھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرے کی خدمت میں ایک عرض داشت پیش کی تھی جس میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا ساتھ ہی یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ مغربی علوم کی تعلیم بھی اردو زبان میں دی جائے۔ جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس اسکیم پر درآمد کا کام کالج کے اردو سیکشن کو سپرد کیا گیا۔ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان علوم کی کتابوں کا اردو ترجمہ کر کے شائع کرائی جائیں، اس کام کی تمام طبقوں کی طرف سے پذیرائی ہوئی۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج: راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین اور دیگر مصلحین کی کوششوں سے برادرانِ وطن پہلے ہی مغربی تعلیم کی طرف راغب ہو چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے کھل گئے تھے۔ 19 ویں صدی سے ہی یہ لوگ سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونا شروع ہوگئے اور رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے گئے۔ وہیں دوسری جانب مسلمان اس میدان میں بہت پیچھے رہ گئے۔ سرسید ان حالات کی طرف سے بڑے متفکر تھے، مسلسل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلم معاشرہ کی تمام بیماریوں کا علاج مغربی تعلیم میں مضمر ہے۔ اپنے انگلستان کے قیام کے دوران سرسید نے وہاں کے تعلیمی نظام کا بغور مشاہدہ کیا۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی گئے اور وہاں کے تعلیمی نظام کا خاکہ مرتب کیا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی طرز پر ایک ایسے ادارے کے قیام کے لیے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ 8 جنوری 1878 کو وائسرے ہند لارڈ لٹن (LORD LYTTON) کے ہاتھوں کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ ابتدا میں کالج میں دو شعبے قائم کیے گئے۔ ایک شعبہ انگریزی جس میں عام نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی اور دوسرا شعبۂ علوم مشرقیہ جس میں عربی، فارسی علوم کے والسنہ کے ساتھ جدید علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی بعد میں یہی کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہوگیا۔ جو آج پوری دنیا میں ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے اور ہر ملک کے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ جو ہمارے لیے باعث فخر ہے۔

سرسید نے 1886 میں علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ اس کانفرنس نے علی گڑھ تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرانے میں اہم خدمات انجام دیں۔ اس کے سالانہ جلسہ ہوتے جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے دانشور جمع ہوتے اور عوام کو تعلیمی نظام کے جدید تقاضوں سے متعارف کراتے اور مغربی تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتے۔ اس سے قبل محمڈن اورینٹل کالج قائم ہو چکا تھا اور تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ اس کے باوجود سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلم عوام میں تعلیم عام کرنے کے لیے ایک کالج کافی نہیں ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے ایک ایسی فعال انجمن کی ضرورت کو محسوس کیا جو ملک گیر سطح پر عوام میں تعلیمی ضرورت کی کفالت کر سکے۔ اس کے سالانہ جلسے ملک کے مختلف مقامات پر ہوتے جن کا بنیادی مقصد تعلیمی میدان میں عوام کی پستی کے اسباب کا جائزہ لینا اور ان کو دور کرنے کے اقدامات تجویز کرنا تھا اور ان کا تجزیہ کرنا بھی شامل تھا۔

علی گڑھ تحریک کی بدولت سماج میں تعلیم و تدریس کا ذوق پیدا

ہوا،اس زمانے میں بیشتر لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔سرسید کی تحریک کے ذریعہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج عام ہوا۔خواتین میں تعلیم کے حصول کا ذوق بھی اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔اس سے پہلے اس کی سخت مذمت کی جاتی تھی،غرض ہماری سماجی زندگی میں علی گڑھ تحریک کے بڑے اہم نقوش ثبت ہوئے جو خود علی گڑھ تحریک کی کامیابی کا راز بھی ہے۔

علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر ایک تعلیمی تحریک تھی جس کا مقصد ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنی نشوونما کرنا تھا۔انیسویں صدی عیسوی دیگر مشرقی ممالک کی طرح ہندوستان کے لیے بھی عہد تغیر کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ فخر علی گڑھ کو حاصل ہے کہ مسلمانوں کو اس سے بیدار کرنے اور مسلم معاشرہ کے احیاء کی تحریک کا آغاز اس سرزمین سے ہوا۔اس طرح علی گڑھ نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں کلیدی رول ادا کیا۔

سرسید نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں ہندوستانی باشندوں کی فلاح و بہبود کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف نفرت کو اپنے دل سے نکالیں،انگریزی حکومت کی مخالفت کو ترک کریں اور اپنی تمام تر صلاحیتیں تعلیم کے فروغ کے لیے صرف کردیں۔اسی طرح وہ ترقی یافتہ ممالک کے برابر آسکیں گے۔سرسید کے خیال میں یہ حکمت عملی مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری تھی اس لیے کہ وہ تعلیمی میدان میں دیگر ہندوستانی اقوام سے کم از کم ڈیڑھ سو سال پیچھے تھے۔انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر مسلمان پھر سیاست میں ملوث ہوگئے تو انھیں وہی روزِ بد دیکھنا پڑے گا،جو 1857 کی بغاوت کی ناکامی کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔مزید یہ کہ سیاست میں داخل ہوجانے کے بعد ان کی تعلیمی سرگرمیاں پست پڑ جائیں گی۔اسی لیے سرسید مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ سرسید انگریزوں کے حامی اور تحریک آزادی کے دشمن ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔وہ چاہتے تھے کہ پہلے مسلمان پڑھ لکھ کر حکومت چلانے کے قابل ہوجائیں پھر حصہ لیں۔یہی وجہ تھی جس کی وجہ سے سرسید مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے سخت مخالف تھے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی اس تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''سرسید کی شخصیت بہت بڑی ہے،انہوں نے ہندوستانی قوم کو جگانے اور بڑھانے کا کام تحریک کے طور پر کیا۔انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی قوم تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہے،اور خاص طور سے مسلمان۔انگریزوں نے چونکہ حکومت مسلمانوں سے حاصل کی تھی اس لیے انگریزوں کی دشمنی مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔''

(اردو ادب کی تاریخ،ص60)

مذہب: سرسید نے مذہبی اقدار کے سلسلے میں جو کچھ لکھا اس سے مسلمانوں میں بڑی برہمی پیدا ہوئی کیونکہ اس زمانے میں ہر طرف سائنس کا چرچہ ہونے کی وجہ سے ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا تھا،اسی لیے سرسید نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مذہب اسلام کی کوئی بات سائنس کے خلاف نہیں۔ویسے تو سرسید مذہبی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتے تھے مگر ان کی مشکل یہ تھی کہ کسی بھی کام کو کرتے وقت گناہ اور ثواب کا مسئلہ آجاتا اور سرسید اس وجہ سے اپنا کام نہیں کرسکتے تھے۔آخر کار انھیں مجبوراً یہ بتانا پڑا کہ جس چیز کو تم مذہب سمجھتے ہو وہ دراصل مذہب ہے ہی نہیں۔اس لیے سرسید نے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' نکالا۔الطاف حسین حالی ''حیاتِ جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور ان کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔انھوں نے اس پرچہ کے نکالنے کا ارادہ ولایت میں ہی کرلیا تھا کیوں کہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپتی تھی اس کا ٹائپ وہ لندن سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔'' (حیاتِ جاوید،ص162)

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سرسید کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ تعلیم کے سلسلے میں جو بھی قدم اٹھائیں گے اس سے پہلے انھیں مذہبی مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سرسید کے دور میں اردو زبان و ادب کو معیار بخشنے کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔اس لیے سرسید نے اردو نثر اور شاعری دونوں کی خامیوں کو دور کرنے پر زور دیا میر امن اور غالب کی سادہ گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا اور ساتھ ہی مذہب،ادب،سیاست،تعلیم،معاشرت،اقتصادیات جیسے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔سادہ،مدلل اور واضح انداز میں اظہارِ خیال کیا،اور جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی۔سرسید کے تعلق سے ''شبلی نعمانی'' لکھتے ہیں:

''زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا۔اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا تاہم مجھے اس بات سے کبھی انکار نہ ہوسکا

کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے، کوئی اور شخص ادا نہیں کرسکتا۔"

(مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی دارالمصنفین، اعظم گڑھ 1950، ص 64)

اس تحریک کے ذریعہ اردو کے بڑے بڑے قلم کار پیدا ہوئے جن کی بدولت علوم وفنون کے مختلف موضوعات پر اہم کتابیں منظر عام پر آئیں۔ حالی نے مقدمہ شعروشاعری اور علامہ شبلی نعمانی نے موازنہ انیس ودبیر وغیرہ جیسی کتابیں شائع کیں۔ اور ان کے دوسرے رفقاء نے بھی دوسرے تنقیدی کام کر کے اردو ادب کے ارتقاء میں حصہ لیا۔ یہاں تک کے سرسید نے بہت کچھ لکھا اور اپنے رفقاء سے لکھوایا اس دور میں اردو نثر اور شاعری کی بہت ترقی ہوئی اور اردو ادب کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی۔

سرسید کو ملک وملت سے بے پناہ لگاؤ تھا اس لیے وہ تمام عمر ملک وقوم کی بھلائی اور اصلاح وترقی کے لیے کوشاں رہے وہ جدت پسند تھے اس لیے انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، جس کام کو شروع کیا اس میں جدت پیدا کر کے اس کا حق ادا کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس قدر ترقی حاصل کریں کہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیں۔

پروفیسر صغیر افراہیم اس تحریک کے بارے میں اپنی رائے اس طرح پیش کرتے ہیں:

> "نتائج گواہ ہیں کہ علی گڑھ تحریک اس لیے امر ہوگئی کہ سرسید کی دور رسی اور دور بینی کے مظاہر حددرجہ کرشماتی ہیں۔ انھوں نے استعماری اور قہرمانی قوتوں سے ٹکر لینے کے لیے مزاحمتی اور مدافعتی طریق کار نہیں بلکہ مفاہمتی انداز بصورت مسابقانہ اختیار کیا مفاہمت میں فرار کا راستہ ترک کیا اور عزیمت کا راستہ منتخب کیا، آزمائشوں کو اپنی دانشورانہ صلح جوئی کے ذریعہ حل کیا، تشدد کی راہ کو اپنایا اور حکیمانہ وقت کے بغیر کسی تردد تامل ایک پیغام دیا کہ ہمیں باغی کہنا غلط ہے اور اسے ثابت بھی کر دکھایا۔"

اگر سرسید نے اس وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد نہ ڈالی ہوتی تو آج پوری قوم گمنامی کے ایسے اندھیرے میں غرق ہوچکی ہوتی جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ آج ہم جو زیورِ تعلیم سے آراستہ نظر آتے ہیں۔ وہ سرسید کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ سرسید کی علمی وادبی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اقبال جو سرسید کے بہت بڑے شیدائی تھے اور سرسید سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ اس کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے:

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

سرسید تحریک کی اہمیت وافادیت مسلّم ہے، اور دورِ جدید میں اس کی اشد ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور ہر دور میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی رہے گی۔

حواشی

(1) سید حامد وائس چانسلر، علی گڑھ تحریک، ص 6

(2) لیکچرس سرسید احمد خاں، ص 41

(3) تہذیب الاخلاق پہلا شمارہ

(4) پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، اردو ادب کی تاریخ، ص 60

(5) الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص 162

(6) شبلی نعمانی مقالاتِ شبلی (جلد دوم) مرتبہ: سید سلیمان ندوی دارالمصنفین، اعظم گڑھ 1950، ص 64

کتابیات

(1) پروفیسر صغیر افراہیم، عصرِ حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت ومعنویت، براؤن پبلی کیشنز نئی دہلی 2019

(2) ڈاکٹر شائستہ خاں، مرتبہ علی گڑھ تحریک ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2017

(3) الحاج اخلاص احمد شیروانی سرسید اور علی گڑھ تحریک مشکوۃ کمپیوٹرس علی گڑھ، اینڈ خالد 2015

(4) نسیم قریشی مرتب علیگڑھ تحریک (آغاز تا امروز) زیرِ ہدایت پروفیسر رشید احمد صدیقی پروفیسر آل احمد سرور احباب پبلشرز لکھنؤ 1960

(5) عشرت علی قریشی مترجمہ محمد ضیاء الدین انصاری، علی گڑھ تحریک (ایک تعارف) شعبہ رابطہ عامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1981

(6) پروفیسر خلیق احمد نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1982

(7) سید حامد وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، خدا بخش خطبہ علی گڑھ تحریک، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 84-1983

□□□

Saba Naushad
Research Scholar
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)
sabanaushad20@gmail.com

عمران عاکف خان

اردو رپورتاژ نگاری میں 'خواتین' کی حصے داری

اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری اور شائق مختلف دلچسپ اور متعدد خوش گوار مرحلوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ مرحلے، پھر مرحلانِ شوق بن جاتے ہیں۔ ان مراحل میں کہیں تو تحریکات آتی ہیں اور کہیں زبان و ادب کے تئیں اصلاحی اقدامات و کاوشیں۔ کہیں جدید و معاصر لسانیات سے ہم آہنگی اور قبولیت و قدر کی قدریں ہیں تو کہیں ضرورت اور وقتی تقاضوں کے مطابق اصناف کے اضافے اور مناسب تراش خراش۔ یوں ادبیات اُردو پروان چڑھتی رہیں اور ان میں علوم، فنون، افکار، طریق ہائے اظہار اور اصناف سخن و بیان کا اضافہ ہوتا گیا۔ ایسی ہی ایک صنف ''رپورتاژ'' بھی ہے جو صحافت اور افسانے کی درمیانی تحریر کہی جاتی ہے۔ اس کا آغاز تو گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں ہوا مگر عروج اور اس کا فروغ اگلی دہائی میں اُردو ادب کی ہنگامہ خیز تحریک 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کے زیر اثر ہوا جب سرخیلان انجمن اور اس کے حاملین: سجاد ظہیر، کرشن چندر، ابراہیم جلیس، وحید اختر، تاجور سامری، عادل رشید، فکر تونسوی، جمنا داس اختر، انور عظیم، پرکاش پنڈت، رضیہ سجاد ظہیر، زہرہ جمال، سلمیٰ صدیقی، صفیہ اختر، خدیجہ مستور، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، شاہد احمد دہلوی، قرۃ العین حیدر ——— نئے لوگوں میں قاضی عبدالستار، سید ضمیر حسن دہلوی وغیرہ نے متنوع اور گراں قدر رپورتاژ لکھیں اور اس نئی رسم کو بطور صنف اردو ادب میں رواج دیا۔

رپورتاژ نگاری کے اردو ادب میں وجود اور عمل داری، اس کی مقبولیت اور اثر پذیری اور اُردو رپورتاژ نگاری میں 'خواتین' کی حصے داری کے احوال کے بیان سے قبل، چند امور کا تذکرہ ضروری لگتا ہے۔ مثلاً: لفظ رپورتاژ کی مادیاتی تحقیق، عالمی لسانیات و ادبیات میں اس کے آغاز کا

قصہ،اس کی مقصدیت وافادیت نیز سفرشوق میں اس کی جستجو — اسی طرح رپورتاژ نگاری کیا ہے؟اس کے مقاصد واہداف کیا ہیں؛اس کی رسمی ضرورت کیوں اور کیسے ہے؟ادبیات اردو میں اس کے آغاز کی تاریخ اور سن کیا ہے؟

رپورتاژ کا لفظ سب سے پہلے 1963 سید ابوالخیر کشفی نے اپنی کتاب ''جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے'' میں استعمال کیا ہے۔انگریزی زبان کا لفظ ''Reportage'' اردو میں تصرف کے ساتھ داخل ہوا۔عربی رسم الخط میں یہ بطور اسم مستعمل ہے۔رپورتاژ اسم معرفہ مذکر ہے۔(1)

☆لانگ مین یونیورسل ڈکشنری میں 'لانگ' نے رپورتاژ کی تعریف یوں کی ہے:

خبر نگاری کا عمل۔ایسی تحریر جس کا مقصد [کسی] سانحے کی حقیقی تصویر پیش کرنا ہو۔(2)

☆ڈیوڈ گرامبس نے لٹریری کمپینئن ڈکشنری میں رپورتاژ کا مطلب کچھ اس طرح لکھا ہے:

ایسی خبر نویسی یا حالات حاضرہ کی اصل رپورٹنگ جو براہِ راست مشاہدے، دستاویزی حیثیت، حادثات یا حالات، خبر نویسی یا نیوز اسٹوری پر مبنی ہو۔(3)

☆ایجوکیشنل 21st سنچری ایڈوانس ڈکشنری کے مطابق:

رپورٹنگ کا مخصوص وانوکھا طریقۂ کار جو بالعموم اخبار، ریڈیو یا ٹیلی ویژن میں اسٹوری کی غرض سے اختیار کیا جاتا ہے، وہ رپورتاژ کہلاتا ہے۔ ہاں!اس کا طریقہ خبر نگاری جیسا ہی ہوتا ہے۔(4)

☆محمد حسن عسکری کا بیان ہے:''[رپورتاژ] یہ نام ہی اس لیے اختراع کیا گیا تھا کہ بعض تحریروں کو صحافت اور ادب دونوں سے الگ کیا جاسکے۔''

☆احتشام حسین یوں کہتے ہیں:''رپورتاژ کو ہم واقعات کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں۔''

☆ڈاکٹر ثریا حسین رپورتاژ کی وضاحت کرتی ہوئی تحریر کرتی ہیں:

رپورتاژ ایک فرانسیسی لفظ ہے اور چند سال سے اردو میں مستعمل ہو چکا ہے۔رپورتاژ میں رپورٹر بیرونی حقائق کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ میں اپنے ذاتی تاثرات کو بھی پیش کرتا ہے جب کہ رپورٹ یا سفرنامہ محض حقائق پر مشتمل ہوتا ہے۔(5)

☆ڈاکٹر طلعت گل کی تحقیق ہے:

اس کا نام فرانسیسی ادب کی دَین ہے۔''رپورتاژ'' اس کا فرانسیسی تلفظ ہے۔انگریزی میں رپورتاژ کو ''رپورٹ ایج'' کہتے ہیں۔اردو میں جدید صنف کو ''رپورتاژ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔متعدد لغات میں اس صنف کو ''رپورٹ'' کے ہی ہم معنی قرار دیا گیا ہے —— زمان ومکان کے تعین کے ساتھ چشم دید حقیقی واقعات کی حقیقی کرداروں کے ذریعے زمانۂ حال یا زمانۂ ماضی قریب کی افسانوی انداز میں کی گئی رپورٹنگ ہی رپورتاژ ہے۔(6)

مذکورہ بالا تحقیقات وبیانات کو مجموعی طور پر یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ:

رپورتاژ نگاری اردو نثر کی جدید ترین صنف ہے، جس میں فنی طور پر مجلسوں، ادبی محفلوں، سیمیناروں، کانفرنسوں اور ادبی وفکری اجتماعات کی

رُوداد پیش کی جاتی ہے۔ نیز اس میں افسانوی انداز کی جذباتیت اور غیر افسانوی طرز کی رُوداد نگاری کارفرما نظر آتی ہے۔ عام طور پر چشم دید واقعات وخیال آرائی اور زبان کی چاشنی کے ساتھ بیان کرنا رپورتاژ کہلاتا ہے۔ رپورتاژ میں جہاں واقعات کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے، وہیں احساسات اور تاثرات کو بھی رُوداد کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بیان میں ادبیت اور رومانیت کی ایک جذباتی تصویر ابھر آتی ہے۔ رپورتاژ کی پہچان اس کی اپنی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔ اس صنف میں کوئی بھی گزرا ہوا واقعہ، اظہار کی تہوں تک پہنچتا ہے اور تخلیق کار کے اندر چھپے ہوئے رومانوی احساس کو جگاتا ہے پھر مصورانہ چابک دستی کے ساتھ ایسی تخلیق کو اُجاگر کرتا ہے جو واقعات کی پلیٹ میں مرقع کاری کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں رپورتاژ نگار عینی شواہد کے طور پر ٹھوس، صحیح واقعات اور گزرے ہوئے حادثات کا بیان کچھ اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کے جذبات واحساسات کی شمولیت بھی اس میں ہوجاتی ہے اور اسی کارفرمائی کی وجہ سے اس میں اور نامہ نگاری میں فرق درآتا ہے۔ رپورتاژ میں مخصوص خبر اور جزئیات کی شمولیت کی وجہ سے اس کی تخلیقی حیثیت ایک آزاد صنف کی ہوجاتی ہے۔

رپورتاژ کا وہ ظاہری ڈھانچہ، جنھیں بنیاد بنا کر اس صنف کی شناخت کی جاسکتی ہے وہ ہیں: ہیئت، طوالت، ایجاز واختصار اور ہمہ گیری وغیرہ۔ اس میں کشمکش اور انجام، افسانوی نوعیت کا نہیں ہوتا اور اس میں کلائمکس ہی ہوتا ہے۔ رپورتاژ پر حقیقت کا گہرا اثر ہونے کے سبب ہیئت اور افسانویت سے استفادے کے باوجود بھی اس میں حقیقت پسند اور غیر افسانوی طرز کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ساخت، معنی اور اظہار کے ذریعے کسی فن پارے کا وجود عمل میں آتا ہے، چنانچہ رپورتاژ کی صنف بھی ایک ہیئتی اکائی رکھنے کے باوجود اس میں معنی اور اظہار کے معاملے میں افسانوی اور غیر افسانوی دونوں طرز ہائے اسلوب سے استفادہ کیا جاتا ہے، جس سے اس کے طرز بیان میں حسن پیدا ہوجاتا ہے۔

موزوں اور مناسب الفاظ کے سہارے صحافی اصل واقعے یا حادثے کی رپورٹنگ کرتا ہے۔ جب کہ رپورتاژ کے لیے لازمی ہے کہ وہ واقعے کے بیان اور تصویر کشی کے دوران اس میں اس قدر ڈوب جائے کہ اس کی شخصیت واقعے اور قصے سے منسلک ہوکر واقعے/قصے کے ایک جز کا درجہ حاصل کرلے۔ اس عمل سے گزرنے کے بعد لکھے جانے والا رپورتاژ ہی حقیقی رُوداد پیش کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ رپورتاژ میں افسانویت کا عمل، اظہار کی حد تک روا رکھا جاتا ہے۔ اس صنف میں افسانویت کا داخل ہوجانا ایک ایسا عمل ہے، جس کی وجہ سے مواد اور ساخت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ اس کے اظہار میں حسن اور جمالیاتی کشش پیدا ہوجاتی ہے۔

کسی حادثے، واقعے یا پروگرام کا ظہور پذیر ہونا ایک ایسا عمل ہے جو حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ واقعے کو جزئیات کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے تاکہ اس صنف کی بنیادی ضرورت کی تکمیل ہوسکے۔ ترسیل کے لیے اختیار کی جانے والی زبان نہ صرف الفاظ ومعانی اور مفہوم کو ادا کرتی ہے، بلکہ پیکریت، ایمائیت، یا پھر جمالیاتی احساس کے ذکر کا ذریعۂ اظہار بھی بنتی ہے، جس کی وجہ سے ذوق سلیم کی تربیت اور مفہوم کی ادائیگی کا حق ادا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ ہر فن پارے کے اظہار کے لیے قوت تحریر اس کی صنفی حیثیت کے لحاظ سے مختلف ہوجاتی ہے۔ اسی طرح

رپورتاژ میں ادبیت، صحافت، رومانیت اور افسانویت کا حسین امتزاج ہوتا ہے، جس کی وجہ سے رپورتاژ کی قوت تحریر، اظہار کی تمام تر لذت اور ادبی انداز کی آئینہ دار ہوجاتی ہے۔ اسی لیے اس صنف میں سوانحی انداز، خاکے کی کیفیت، انشائیے کا دروبست، ڈرامے کی مکالماتی روش کے ساتھ ساتھ سفرنامے کی ہیئت، صحافت کی مبصرانہ شان اور رُوداد ورپورٹنگ کی ہمہ گیری کا ایسا تسلسل پایا جاتا ہے، جس کی وجہ اس صنف میں دیگر نثری اصناف کی جھلکیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔

رپورتاژ کے اجزائے ترکیبی:

- چشم دید / حقیقی واقعات / آنکھوں دیکھے حال کا ہونا۔
- کہانی / قصہ پن ہونا۔
- خارجی اور داخلی کیفیات کا ہونا۔
- فنی افسانوی ہیئت [بیانیہ، پلاٹ، کردار نگاری، منظر کشی، وحدت تاثر، زمان ومکان وغیرہ] ہونا۔

رپورتاژ کی اصلیت وماہیت کا مکمل ومفصل علم وادراک ہوجانے کے بعد اب دنیا کی آدھی آبادی کی اُردو رپورتاژ نگاری میں حصے داری کا مرحلۂ ذکر ہے۔ اس ضمن میں 'خواتین' کی خاطر خواہ نمائندگی اور کاوشیں نظر آتی ہیں۔ ان کے ذکر میں سنین وزمان کی ترتیب کے بجائے حروف تہجی کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان 'خواتین' کی ایک مقتدر اور معتبر فہرست ہے جنھوں نے اُردو رپورتاژ نگاری کو اپنے 'صنف مخالف' کے ساتھ ساتھ عروج بخشا اور اُسے بام ثریا تک پہنچانے میں معاون بنیں۔ ان خواتین کے اسمائے گرامی مع رپورتاژ [ماہ وسالِ اشاعت اور مختصر کیفیت] حسب ذیل ہیں:

نام مصنفہ	نام رپورتاژ	سالِ اشاعت	مختصر کیفیت
آمنہ ابوالحسن	دودن	1971	یہ رپورتاژ اجنتا ایلورا جیسے تاریخی غاروں کی سیر پر مبنی ہے۔ 1971 میں اسے رسالہ شاعر، بمبئی/ممبئی نے دو قسطوں میں شائع کیا۔
★ الطاف فاطمہ	اس کا آشوب	1967	اس رپورتاژ میں فلسطین کے ایک کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کا نام ''حسام الخطیب'' جو'مسئلۂ فلسطین' پر افریشیائی کانفرنس میں مقالہ خواں کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، الطاف فاطمہ بھی اس کانفرنس میں ایک مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ یہ رپورتاژ رسالہ 'اوراق' کے 1967 کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔
★ مسز انور رضا	یادوں کے جھروکے	1978	مزید تفصیلات دستیاب نہیں
★ بشریٰ رحمان	باؤلی بھکارن	1982	مزید تفصیلات دستیاب نہیں
★ بشریٰ فرخ	خمینی کے ایران میں	2016	اس رپورتاژ میں 2016 میں ایران میں منعقدہ ''خواتین اور اسلامی بیداری کانفرنس'' میں پڑھے گئے مقالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کانفرنس میں 80 سے زیادہ ممالک کی 1200 خواتین اسکالرز نے شرکت کی تھی۔
★ حجاب امتیاز علی تاج	ہم سفر	1970	یہ رپورتاژ حجاب امتیاز علی تاج نے اپنے شوہر کے 18 اپریل 1970 کو پیش آمدہ بے رحمانہ قتل کے صدمے اور سانحے کے تناظر میں لکھا۔ اس میں اپنے شوہر نامدار سے اپنی رفاقت اور ان کی پوری زندگی کے احوال تحریر کیے ہیں۔

★ خدیجہ مستور	پو پھٹے	1953	رپورتاژ 1953 کے کان پور کے فرقہ وارانہ فساد اور اس کی زد میں آنے کے سبب خدیجہ مستور کے خاندان کے متاثر ہونے کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ اسے ''شاہ راہ'' لاہور نے 1953 میں شائع کیا۔
★ رضیہ سجاد ظہیر	امن کا کارواں	1952	اس رپورتاژ میں 1952 میں کلکتہ میں منعقدہ کل ہند امن کانفرنس و تہذیبی اجتماع کی رُوداد قلم بند کی گئی ہے۔
★ رفیعہ نوشین	کوئی بات اٹھا نہ رکھنا [مجموعہ]	2021	یہ رفیعہ نوشین کے رپورتاژ کا مجموعہ ہے۔ اس میں مختلف مواقع پر منعقدہ اردو تقریبات کی روداد مندرج ہے۔
★ ریاست خانم	کولہاپور میوزک کانفرنس	1961	اس رپورتاژ کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ کولہاپور، مہاراشٹر میں منعقدہ 'میوزک' کانفرنس کی رُوداد اور احوال کے بیان پر مبنی ہے۔
★ زہرہ جمال	5 دسمبر کی رات	1955	5 دسمبر 1955 یعنی نئے آہنگ و خیال کے شاعر مجاز لکھنوی کے انتقال کا دن۔ اس دن ان کے چاہنے والوں اور ان سے محبت کرنے والوں پر صدمات کے کیسے پہاڑ ٹوٹے تھے؟ یہ رپورتاژ ان ہی صدمات کا اظہار ہے۔
★ سلمیٰ صدیقی	نقاب اور چہرے	1968	یہ ایک گھریلو نوعیت کا رپورتاژ ہے۔ دراصل 1968 میں کرشن چندر نے اپنے دولت کدے پر بمبئی میں مقیم ادبا و شعرا کی پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ سلمیٰ صدیقی اس کی میزبان تھیں۔ سلمیٰ صدیقی نے اس رپورتاژ میں ان اُدبا و شعرا سے اپنی بے تکلف ملاقات اور ان کے ظاہر و باطن کے چہروں سے نقاب اٹھائے ہیں۔ اسے رسالہ ''گفتگو''، بمبئی 1968 کے شماروں میں شائع کیا۔
★ سلمیٰ عنایت اللہ	ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ	1963	اس رپورتاژ میں سلمیٰ عنایت اللہ نے ان حالات اور سماجی سوالات کو موضوع بنایا ہے جنھوں نے ان کے شوہر کے جیل جانے کے بعد انھیں آگھیرا تھا۔ سر عنایت اللہ کو 28 اپریل 1956 کو سیاسی انتقام کا نشانہ بناتے ہوئے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اس میں ان پر جیل میں گزری اذیتوں کا حال ہے۔
★ صفیہ اختر	ایک ہنگامہ	1952	1952 میں بھوپال میں ترقی پسند تحریک کا کل ہند اجلاس منعقد ہوا، یہ رپورتاژ اسی اجلاس کی رُوداد ہے۔
★ عصمت چغتائی	بمبئی سے بھوپال تک	1952	بھوپال شہر فرخندہ حال میں 1952 میں ترقی پسند تحریک کا کل ہند اجلاس منعقد ہوا۔ اس رپوتاژ میں عصمت خانم چغتائی نے اسی اجلاس کی رُوداد قلم بند کی ہے۔ اس کی تخصیص یہ ہے کہ یہ مکمل افسانوی انداز میں ہے۔

★ قرۃ العین حیدر	ستمبر کا چاند [چار رپورتاژ: لندن لیٹر۔ستمبر کا چاند [1959] درچمن ہر ورقی حال دگرست [نقوش، لاہور۔[1968] جہان دگر] پدماندی کے کنارے [افکار، کراچی۔1960] چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔کوہِ دماوند [1979] گل گشت [1974] خضر سوچتا ہے وولر کنارے [1979] دکن ساٹھار نہیں سنسار میں [1982] قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔		اردو زبان وادب کی نام ور ادیبہ اور فکشن نگار بلکہ ہر فن مولا، قرۃ العین حیدر یلدرم المعروف بہ عینی آپا کے یہ رپورتاژ متعدد مواقع کی رُوداد اور بیان احوال کا اظہار یہ ہیں۔انھیں اس وقت کے مؤقر رسائل وجرائد نے فخریہ انداز میں شائع کیا۔عالم یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر اس باب میں سب سے سبقت لے گئیں اور ایک ایسا ریکارڈ قائم کر گئیں جسے توڑنا ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ان کے رپورتاژ جہاں ادبی اور لسانیاتی خصوصیات سے بھرپور ہیں، وہیں ان میں ثقافت، تاریخ، تہذیب، تمدن، جہاں بانی اور نیرنگئی عالم کے مناظر بھی موجود ہوتے ہیں۔اس طرح یہ رپورتاژ ایک آئینۂ جہاں نما کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔اتنی بڑی تعداد میں موجود یہ رپورتاژ اردو زبان وادب کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔
★ ممتاز شیریں	ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس	1954	'عالمی ادب اور انسانیت کو درپیش مسائل' جیسے اہم موضوع پر ہالینڈ کے دارالخلافہ 'ہیگ' میں 1954 میں بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ممتاز شیریں نے اس کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔اس رپورتاژ میں اسی کانفرنس کے مکمل احوال درج ہیں۔

مذکورہ بالا رپورتاژ اور ان کے مواقع تحریر اور سبب ہائے تحریر کے تنوعات نیز کیفیات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ادب نواز 'خواتین' نے دیگر اصناف ادب کی مانند ''صنف رپورتاژ'' سے بھی پہلو تہی نہیں برتی بلکہ نام وری اور استناد حاصل کی ہے۔نیز ان رپورتاژوں میں ان قلم کار ادیب خواتین نے رپورتاژ کے تمام اصول ہائے نگارش اور ضابطہ ہائے تحریر کو ملحوظ رکھتے ہوئے قلم بند کیا اور اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔اب یہ تسلیم کرنے میں کسی قسم کا باق نہیں کہ اردو رپورتاژ نگاری میں خواتین کی قابل ذکر اور قابل قدر حصے داری ہے۔

❖❖❖

حوالہ جات:

3-http://urdulughat.info/words/3304

4-Longman Universial Dictionary 1982, Page: 826

5-Literacy Companion Dictionary By Savid Grambs 1984 Words about- words. Page: 313

6-Educational 21st Century Advanced Practical 21st Century Dictionar[English to English and Urdu] S.A. Bhatti etc. Educational Publishing House- Delhi-2008

7۔انتخاب سجاد حیدر یلدرم۔مرتبہ ثریا حسین۔اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔ص:20

8۔اردو میں رپورتاژ کی روایت۔طلعت گل، شبانہ پبلی کیشنز، دہلی۔1996

9۔اردو میں رپورتاژ نگاری۔عبدالعزیز۔ساقی بک ڈپو، دہلی۔2005

10۔اردو نثر کا فنی ارتقا۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔2013

12۔غیر افسانوی اردو نثر [مابعد آزادی] عطیہ رئیس۔ایم آر پبلی کیشنز۔2008

□□□

Mr. Imran Akif Khan

5/4, Fiction Numa

Noor Nagar, Jamia Nagar

New Delhi-110025

imranakifkhan@gmail.com

Mob: 9911657591

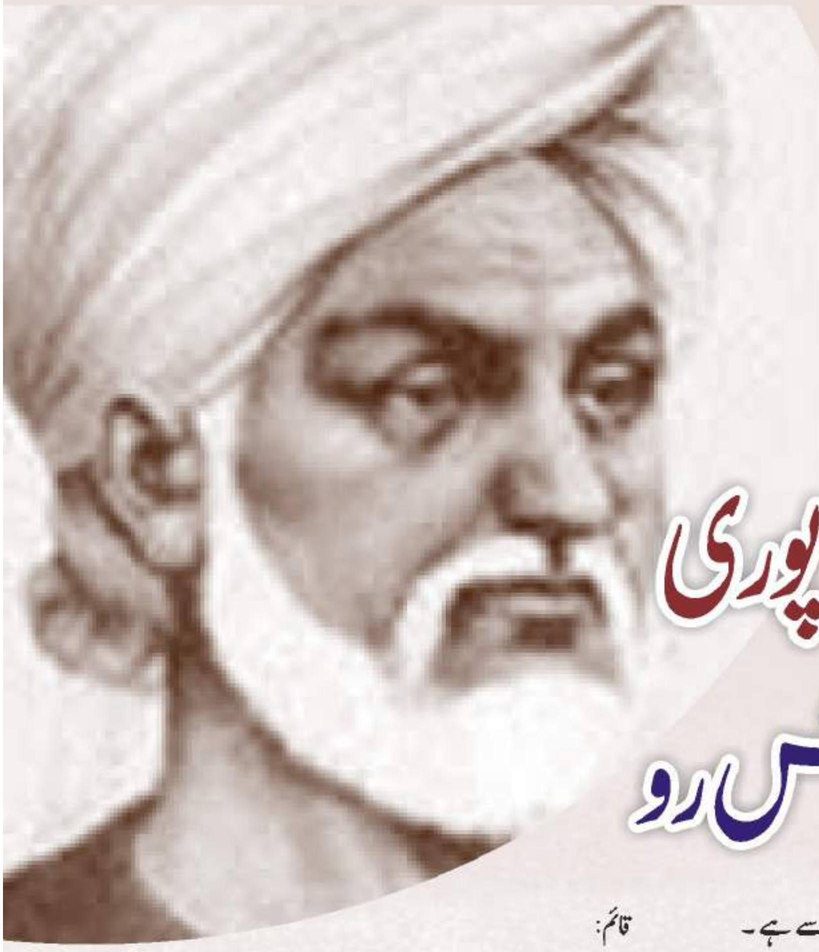

مہر فاطمہ

قائم چاندپوری غالب کا پیش رو

قائم چاند پوری کا تعلق اردو شاعری کے عہد زریں سے ہے۔ انھوں نے میر، سودا اور درد کے پہلو بہ پہلو اردو زبان کو سجانے، سنوارنے اور چار چاند لگانے کا کام کیا۔ شاعری میں قائم کا درجہ یا مرتبہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں تذکرہ نویسوں اور ناقدین نے اپنی اپنی رائے دی ہے۔ جس سے ان کے مرتبہ کا تعین بحسن وخوبی ہوجاتا ہے۔ کسی نے انھیں میر وسودا کا ہم پلہ قرار دیا کسی نے درد سے بہتر اور کسی نے میر وسودا کے بعد درد کے بجائے قائم کا نام لینا زیادہ بہتر بتایا۔ لیکن ان کی اہمیت ومرتبہ کے تعین میں یہ پہلو بھی بہت اہم ہے کہ ان کے بعد کے شعرا نے ان سے کافی حد تک استفادہ کیا۔ خصوصاً مرزا غالب کی شاعری پر قائم کے اثرات جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جنھیں دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی شاعری کے موضوعات کا اصل منبع قائم کی شاعری ہے۔

ماہنامہ ''معارف'' اپریل 1952 کے شمارہ میں ''قائم چاند پوری اور ان کا کلام'' کے عنوان سے اثر رامپوری کا مضمون موجود ہے۔ جس میں انھوں نے قائم کے کئی اشعار کے ساتھ بعد کے شعرا کے اشعار پیش کیے ہیں جن کا مضمون قائم کے یہاں سے اخذ کیا گیا ہے یا قائم کے شعر کو سامنے رکھ کر شعر کہا گیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے:

''مجنوں گورکھپوری نے تنقیدی حاشیے میں قائم کے دو شعر ایسے پیش کیے جن کے مضامین کو مومن اور غالب نے اپنایا ہے:

قائم:

ہوس ہے عشق کی اہل ہوا کو ہم تو یہاں
سننے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

حیرت ہے کہ اس شعر کے ہوتے ہوئے مومن کا یہ شعر کیسے ضرب المثل ہوگیا۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

غالب کا یہ شعر:

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ممکن ہے کہ قائم اس شعر کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہو:

وہ دن گئے کہ اٹھا تا تھا بار نگہت گل
ہے بے دماغی دل ان دنوں گراں مجھے

(اثر رامپوری، معارف اپریل 1952، شمارہ 69)

اثر رامپوری صاحب نے چند اشعار پیش کر کے حیرت کا اظہار کیا ہے۔ اصل حیرت اس وقت ہوتی ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر اشعار ایسے ہیں جن کا مضمون قائم کے یہاں سے اخذ کیا گیا ہے۔ بعد کے ناقدین نے بخوبی نشاندہی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اثر رامپوری 1952 میں

مضمون لکھ رہے ہیں اس وقت اس طرف توجہ نہیں دی گئی تھی مگر بعد میں یہ انکشاف کیا گیا لیکن پھر بھی آج لوگ اس سے واقف نہیں ہیں کہ غالب نے کہاں تک قائم کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔

قائم کی غزل کے اشعار میں اکثر سہل ممتنع کی لازوال مثالیں ہیں۔ اس طرح کی دوسری مثالیں غالب کے علاوہ اردو شاعری میں موجود نہیں۔ قائم کی خوش بختی یہ ہے کہ غالب ان سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہ قائم ایسے چند خوش بخت شاعروں میں سے ہیں جس نے غالب کو متاثر کیا۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ غالب نے جتنا تصرف یا اکتساب فیض قائم کے اشعار سے کیا ہے اتنا کسی اور شاعر سے نہیں کیا۔ یہاں تک کی بیدل سے بھی نہیں جن کے بارے میں غالب کا خیال تھا:

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

نہ ہی غنی کاشمیری اور نہ ہی کسی شاعر کا اتنا عمل دخل نظر آتا ہے جتنا کہ قائم کا۔ ظاہر ہے کہ یہ قائم کی غزل کا ایک تابناک پہلو ہے۔ اس حوالے سے خالد علوی کا مضمون ''قائم اور غالب'' نہایت اہم ہے جس میں انھوں نے سو سے زیادہ اشعار کی تعداد بتائی ہے جن کا مرکزی خیال قائم کے اشعار سے ماخوذ ہے اور نہ صرف انھوں نے دعویٰ کیا ہے بلکہ غالب اور قائم کے ایسے پچیس اشعار مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے غالب کے دو خطوط بطور حوالہ پیش کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

7 مارچ 1864 کے خط بنام غلام غوث بے خبر میں لکھتے ہیں:

''جناب عالی!

ایک شعر استاد کا مدت سے تحویل حافظہ میں چلا آتا ہے:

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کھا
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے از راہ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی:

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

تم اخوان الصفا میں سے ہو۔ تمہاری آزردگی اوروں کی مہربانی سے خوشتر ہے۔''

ایک دوسرے خط میں بنام چودھری عبدالغفور جولائی 1863 میں لکھتے ہیں:

''وہ چیزے دگر'' پارسیوں کے حصے میں آئی ہے۔ ہاں اردو میں اہل ہند نے پائی ہے۔ میر تقی علیہ الرحمہ:

بدنام ہوں گے جانے بھی دو امتحان
روٹھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن واں جنس گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز تر نشتر ہیں۔''

(غالب کے خطوط، مرتبہ: خلیق انجم، جلد دوم، ص614)

مندرجہ بالا دونوں خطوط مختلف موضوعات کے حامل ہیں۔ پہلے خط میں ضمناً قائم کا ذکر آیا ہے اور دوسرے میں اہل ہند شعرا کی ستائش مقصود ہے۔ کل ملا کر انھیں دو جگہوں پر قائم کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے جس طرح سے اکتساب فیض کیا ہے اس طرح کا اعتراف موجود نہیں۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ غالب جیسا خود پرست شاعر پہلے خط میں قائم کو استاد لکھ رہا ہے اور دوسرے خط میں قائم کا شمار یا قائم کا ذکر اساتذہ کے ساتھ کر رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب قائم کا شمار میر و مرزا کے ہم رتبہ شاعروں میں کر رہے ہیں اور یہ دونوں تحریر قائم سے متعلق تاثرات کا بین ثبوت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قائم کے اشعار سے اکتساب فیض میں استاد ماننے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ خالد علوی صاحب نے قائم کے جن اشعار کا تتبع پایا اس کی فہرست درج ذیل ہے:

اشعار:

قائم	غالب
دو چند گریہ کر تبرید سے ہوئی تب عشق	تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
زیادتی کی مرض کے ہے یاں دوا باعث	تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے
شکوہ نایافت کا ہے کیوں ناداں	ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت
کی ہے ملنے کی تیں کب اس کے تلاش	دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
ہاتھوں سے دل و دیدہ کے آیا ہوں نپٹ تنگ	حیراں ہوں، دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں
آنکھوں کو روؤں یا کروں سرزنش دل	مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
کوئی اپنی خاطر ایسا کہیں اک مکان ہووے	رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
کہ نہ یہ زمین ہووے، نہ یہ آسمان ہووے	ہم سخن کوئی نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
جی میں ہے اس پرے اس عالم کے	بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
جا کوئی جھوپڑا بسائے گا	کوئی ہم سایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو

پہنچے واں بے خودی میں ہم کہ خیال
جس جگہ جا سکے نہ عنقا کا
میں کہا ''عہد کیا کیا تھا رات؟''
ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں
مثل آئینہ آبرو ہے تو دیکھ
ورنہ گھر میں تو اپنے خاک نہیں
آج جی میں ہے کہ کھل کر مے پرستی کیجیے
خوب سی مے پیجیے اور دیر مستی کیجیے
دل ڈھونڈتا سینے میں مرے بوالعجبی ہے
ایک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے
اس چمن میں دیکھیے کیوں کر بسر ہوا ے نسیم
ہے مزاج نکہت گل شوخ اور ہم بے دماغ
وہ دن گئے کہ اٹھاتا تھا ناز نکہت گل
ہے بے دماغی دل ان دنوں گراں مجھ کو
خاک ہے اس مہر گردوں پر کہ یوں ماٹی کے بیچ
صورتیں کیا کیا دیں اتنی خرم وشاداب، داب

....

چرچے سے اگر ہو صحبت غم
شادی سے ہزار جا ہے بہتر
کس سے کہوں حال بد کہ وہ آپ
کچھ مجھ سے بھی جانتا ہے بہتر
قائم جو کہیں ہیں فارسی یار
اس سے تو یہ ریختہ ہے بہتر
قائم امروز اگر قدر سخن نیست چہ شد
آخر ایں جنس بیک روز گراں مد کردد

میں عدم سے پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا
تم ان کے وعدوں کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں
ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے، کہ اس میں آگ دبی ہے
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

....

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے
سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی، نغمہ شادی نہ سہی
غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواید شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواید شدن

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خالد علوی نے مونوگراف میں قائم کے شعر کے مقابلے میں غالب کے ایک فارسی شعر کو نقل کیا ہے جسے میں نے ہو بہو پیش کر دیا ہے۔ وہ شعر یوں ہے:

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواید شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواید شدن

لیکن جب میں نے اس شعر کو تلاش کیا تو یہ شعر کچھ یوں ہے:

تاز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

خالد علوی صاحب نے پہلے مصرعے کے دوسرے شعر اور دوسرے مصرعے کے دوسرے شعر کو ایک شعر میں یکجا کر دیا ہے جس کی وجہ سے معنوی خلا بھی پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن ''کوکبم را در عدم'' والے مصرعے کے ساتھ یہ شعر مکمل اور بامعنی معلوم ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ''خواید شدن'' کے بجائے ''خواہد شدن'' ردیف کے طور پر غزل میں استعمال ہوا ہے۔

پچھلے صفحات پر پیش کی گئی مثالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں تو غالب نے مضمون پورا کا پورا بغیر کسی تبدیلی کے ساتھ اخذ کر لیا ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اظہار کے پہلو کو مزید اثر دار رکھا ہے۔ کہیں غالب کے یہاں کوئی شعر ردیف وقافیہ اور بحر کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے کہیں انھوں نے صرف ایک لفظ کے الٹ پھیر سے شعر کو پر لطف بنا دیا ہے، کہیں دوسرا مصرع تبدیل کر دیا ہے اور کہیں کہیں بالکل دوسری شکل بخش دی ہے جس سے ان کی خلاقی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے ڈرامائیت پیدا کر کے شعر کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے۔

کہیں کہیں نہ صرف مضمون لیا گیا بلکہ الفاظ بھی وہی استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً ''واں وہ غرور وناز'' والا شعر یا عقوبت، سزا، گناہ والا شعر۔ جب بھی قائم کا شعر پڑھیں تو غالب کا شعر خود بخود ذہن میں آجاتا ہے۔ قائم نے ایک شعر میں ''تبرید'' استعمال کیا ہے جس کو خالد علوی نے غیر شاعرانہ ٹھہرایا ہے۔ غالب نے اسی ''تبرید'' کو جمع کی صورت میں ''تبریدیں'' استعمال کیا ہے۔ ''عنقا'' کا لفظ اور مضمون دونوں قائم کے یہاں سے ہی ماخوذ ہے۔ غالب کی بد دماغی اور انا پرستی والے اشعار بھی قائم کے یہاں موجود ہیں مثلاً نکہت والے اشعار۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قائم وہ پہلے شاعر ہیں جو نکہت گل کا بار اٹھانے کو تیار ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قائم کا کوئی

ایک شعر غالب کے کئی اشعار کا محرک ہے اور قائم کی مختصر بحر کی غزل میں تین اشعار غالب کے تین مختلف اشعار میں نظر آتی ہے۔

یہاں تک کہ خالد علوی نے لکھا ہے کہ غالب نے قائم کے ایک بے مزہ شعر کو اپنے کلام میں شامل کر کے اور بے مزہ بنالیا ہے۔ مثلاً

''قائم کا مطلع ہے:

آج ناداں حسن پر جس تن کے تو مغرور ہے
کل وہ طعمہ کرم کا ہے، اور غذائے مور ہے

غالب نے اس بے مزہ شعر کو اور بھی بے مزہ کر کے اپنے کلام میں شامل کیا:

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخور عقد گہر، انگشت

اکثر مطبوعہ نسخوں میں دیداں کی جگہ دنداں شائع ہوا ہے۔ کالی داس گپتا رضا نے دیداں لکھا ہے۔ نسخہ عرشی، دیوان غالب، مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں ''دنداں'' ہے۔ دانتوں میں انگلی دبانا محاورہ ضرور ہے لیکن دانت میں انگلی داب کر دانتوں کا رزق نہیں بن جاتی۔ ''دیداں'' سے شعر بامعنی ہو جاتا ہے۔ جب غالب کے استاد معنوی قائم نے طعمہ کرم اور غذائے مور لکھا ہے تو یقین ہے کہ غالب نے بھی ''دیداں'' ہی لکھا ہوگا۔

اسی غزل کا ایک شعر:

شیخ جی مانا میں اس کو فرشتہ ہو تو ہو
ایک حضرت آدمی ہونا نہایت دور ہے

دوسرے مصرعے کو غالب نے مزید معنویت عطا کر دی ہے:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''

(قائم چاند پوری، مونوگراف، خالد علوی، ص136)

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ غالب نے قائم سے استفادکر کے چار چاند لگا دیے لیکن ایک مثال ایسی بھی آئی بقول خالد علوی کہ غالب نے اس بے مزہ شعر کو اور بھی بے مزہ کر کے اپنے کلام میں شامل کرلیا ہے۔ کس نے کس شعر کو کتنا بدمزہ کیا یا زیادہ بے مزہ شعر کے لحاظ سے دونوں میں سے کون سبقت لے گیا یہ سوال ہمارے ناقدین پر چھوڑتے ہوئے نہایت اہم سوال کی طرف رخ کرتے ہیں کہ آخر قائم کو ہی کیوں منتخب کیا؟ یا قائم کی طرف ان کی رغبت کیوں پیدا ہوئی؟ ظاہر ہے کہ غالب کوئی معمولی ذہن کے مالک تو تھے نہیں اور نہ ہی غالب سے قبل اچھے شاعروں کی کوئی کمی تھی۔ اس سوال کا جواب خالد علوی کے مضمون کے آخری پیراگراف میں بخوبی موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غالب نے قائم کی خوشہ چینی عجز بیانی یا مضامین کے فقدان کی وجہ سے نہیں کی بلکہ غالب جو معنی آفرینی کو شاعری سمجھتے تھے قائم کی شاعری کو اپنی میزان پر کھرا پاتے ہیں۔ غالب خود اپنی ہی مشکل پسندی اور بیدلیت کے خلاف ردعمل ظاہر کر رہے تھے جب وہ قائم کی شاعری میں معنی آفرینی، تسلسل، سادگی اور میر کی سی زبان سے دوچار ہوئے تو ناچار انھیں یہاں سر جھکانا پڑا۔''

میں اس رائے سے سو فیصدی اتفاق کرتی ہوں کہ غالب کی خوشہ چینی عجز بیانی یا مضامین کے فقدان کی وجہ سے نہیں کی بلکہ غالب معنی آفرینی کے مداح تھے، اس کو اچھی شاعری مانتے تھے اور اس میزان پر قائم کو کھرا پاتے تھے۔ جیسا کہ ذکر آیا کہ وہ اپنی مشکل پسندی اور بیدلیت کے خلاف ردعمل ظاہر کر رہے تھے اس لیے جب وہ قائم کی شاعری میں معنی آفرینی، تسلسل، سادگی اور میر کی سی زبان سے دوچار ہوئے تو ناچار انھیں سر جھکانا پڑا۔ یہ قائم کی شاعرانہ صلاحیت، مہارت اور قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔ اس سے جہاں ان کی خوش بختی سامنے آتی ہے کہ غالب نے ان سے استفادہ کیا وہیں ان کی استادی بھی مسلم ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ابتدا میں ذکر آیا کہ قائم کے اشعار کو وہ شہرت نہ ملی جو ان سے استفادہ کردہ اشعار کو مل گئی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ برگد ایسا درخت ہے جو بہت سایہ دار ہوتا ہے۔ نتیجے میں اس کے سائے میں تناور سے تناور پودا بھی پوری طرح نشو ونما نہیں پاتا۔ قائم چاند پوری بھی سودا اور میر کے ''برگدی زمانے'' میں پیدا ہوئے اور اپنی تمام تر ذہانت اور شعری اعتبار سے تخلیقی امکانات کے باوجود اس برگدی سائے کے شکار ہوئے۔ یہ پرانی بات تھی لیکن حال میں رفتہ رفتہ ان کی طرف توجہ دی جا رہی ہے اور قائم شناسی کا بہترین قدم اٹھایا جا چکا ہے اب وہ دن دور نہیں کہ ان کو بھی وہ درجہ ملے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔

□□□

Mehar Fatima
C-206,Saranya Sarovar Apartment
Hugdur Main Road
White Field
Bangalore-560066 (Karnataka)
Mob: 9555949032

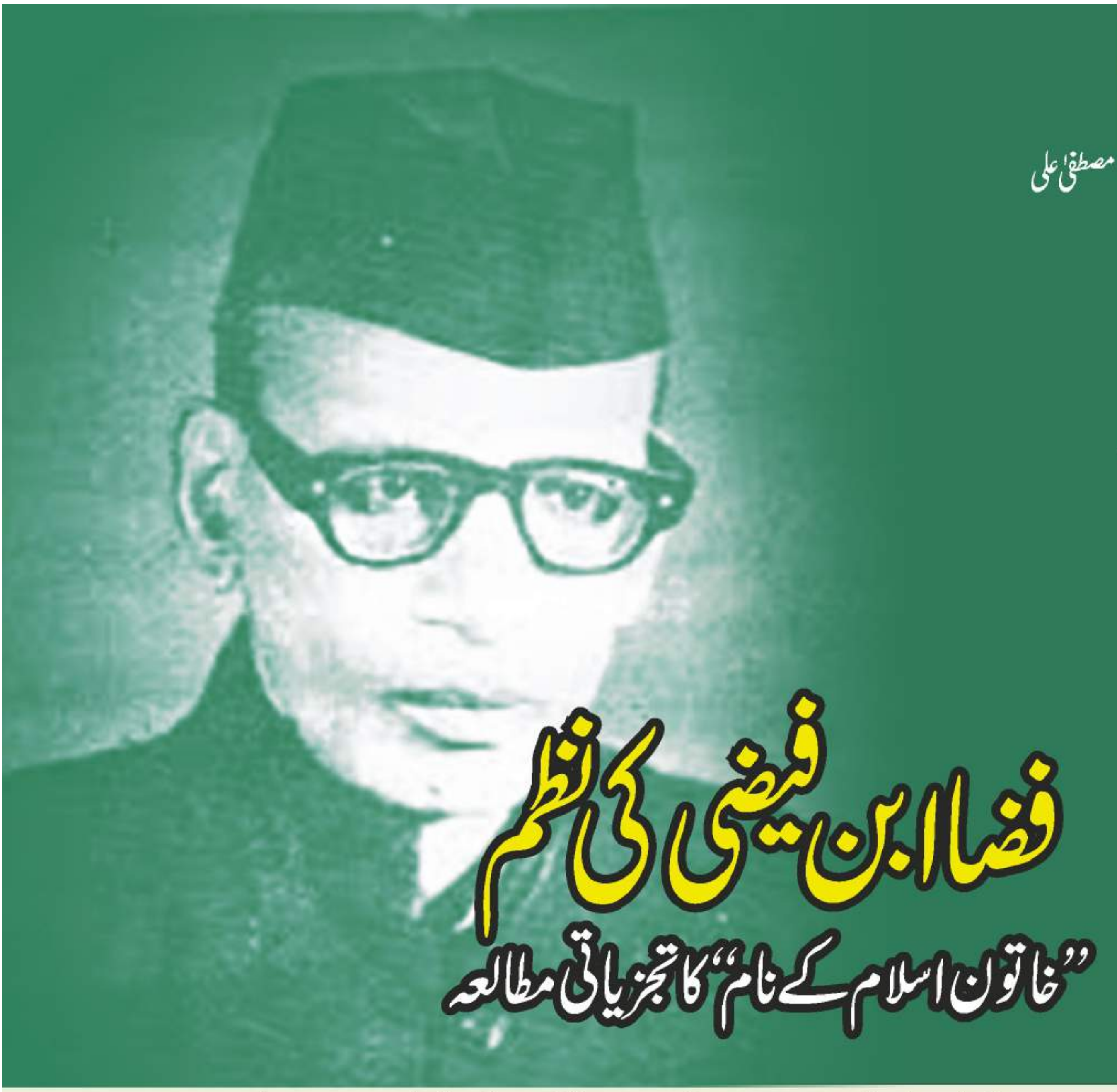

فضا ابن فیضی کی نظم

''خاتون اسلام کے نام'' کا تجزیاتی مطالعہ

مصطفیٰ علی

فضا کی منظومات کے دو مجموعے ہیں۔ پہلا ''شعلۂ نیم سوز'' جو کہ 1978 میں شائع ہوا اور دوسرا ''سرشاخ طوبیٰ'' جو کہ 1990 میں شائع ہوا۔ان کی نظم ''خاتون اسلام کے نام'' ان کے دونوں مجموعوں میں شامل ہے۔ یہ نظم فضا کی ایک شاہکار نظم ہے جو 1964 میں لکھی گئی ہے۔ بعد میں اس نام سے مولانا وحیدالدین خان اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے بھی کتاب لکھی۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے تو اپنی کتاب میں فضا کی اس نظم کو شامل بھی کیا ہے۔گویا مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم میں ہچکولا کھاتی عورت اس وقت کا اہم موضوع بن چکی تھی۔ یہ نظم معشر کی ہیئت میں تین بندوں پر مشتمل ہے۔

فضا نے اس نظم میں مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب پر فوقیت دیتے ہوئے ایک کی اچھائی اور دوسرے کی برائی بیان کی ہے۔فضا کو مشرقی تہذیب کی سادگی، شرم وحیا، پردہ داری، پاک دامنی اور جذبۂ ایثار بہت پسند ہے اور ان کی خواہش ہے کہ مسلم خواتین اسی تہذیب سے بہرہ مند ہوں۔ان کو مغربی تہذیب کی فیشن زدگی، بے حیائی اور عریانیت سخت ناپسند ہے اس لیے ان کی دلی تمنا ہے کہ ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں اس کی دلدادہ نہ بنیں۔

مشرق میں مسلم ہو کہ غیر مسلم سب میں سادگی وعفت وایثار کو عورت کی پہچان مانی جاتی ہے، شرم وحیا کو یہاں کی عورتوں کا زیور تصور کیا جاتا ہے اور پورے بدن کو چھپا لینے والا لباس پہننے کو ان کی شان نسوانیت سمجھی جاتی ہے۔جب یہاں کی عورتیں مغربی چمک دمک سے مائل ہو کر اپنی ان خصوصیات وشناخت کو گنواں بیٹھنا چاہتی ہیں تو شاعر کی دینی وملی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے اور وہ انھیں اس گمراہی سے آگاہ کرنے اور

روکنے کے لیے ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

ہے تری نسوانیت کا بانکپن شرم و حیا
رنگ بن کر وقت کے سیمیں دریچوں پر نہ جھول
مانگتی ہے مغربی تہذیب سے تو روشنی
ظلمت شب سے نہیں ممکن اجالے کا حصول

''وقت کا سیمیں دریچہ'' کہہ کر فضا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سارے مزے اور عیش وطرب، یہ ساری نمائشیں اور چمک دمک محض وقتی ہے، اس لیے اے میری مشرقی ماؤ اور بہنو! سادگی سے رنگینی اختیار مت کرو۔ آج بھی یہ بحث جاری ہے کہ آیا عورت کا چراغ خانہ رہنا بہتر ہے یا رونق محفل ہونا اس کی ترقی کی نشانی ہے۔ مغرب اور اس سے متاثر لوگوں کے اعتبار سے عورت کو بھی پوری آزادی ملنی چاہیے، اسے بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کا موقع دیا جانا چاہیے، کلب، پارک، ساحل سمندر اور رقص وسرور کی محفلوں میں اسے جانے سے نہیں روکنا چاہیے کیوں کہ مرد اور عورت دونوں برابر ہیں، اس طرح ان کا رونق محفل ہونا وقت کی ضرورت اور ترقی کی علامت ہے اور مشرقیت دقیانوسیت کی نشانی۔ جب کہ مشرق اور اس سے متاثر لوگوں کے اعتبار سے عورت کا ایسا ہونا سیفٹی کو غیر یقینی بنا دے گا۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں برابر ہیں لیکن بس اتنا سا فرق ہے کہ یہ دونوں کو مختلف مانتے ہیں۔ ان کے مطابق دونوں کے درمیان تخلیقی فرق ہے، اپنے اسی تخلیقی فرق کی بنا پر دونوں زندگی کے ہر شعبے اور معاشرے میں یکساں طور طریق نہیں اپنا سکتے۔ اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو اس سے ان کی زندگی میں مصیبت ومشکلات کا سیلاب آسکتا ہے، ان کی عزت وآبرو خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا ان کی جان اور عصمت کی حفاظت کے پیش نظر ان کا چراغ خانہ ہونا زیادہ بہتر ہے۔ یہ مغربیت کو فحاشیت کا دوسرا نام گردانتے ہیں اور اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔

آج کی تانیثیت بھی مغربیت سے متاثر ہے اور وہ مشرقیت کے خلاف احتجاج وبغاوت کرتی ہے۔ تانیثیت کی تین شکلیں سامنے آئی ہیں۔ اپنی پہلی شکل میں اس نے نسائی وجود کو منوانے اور مستحکم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی دوسری شکل عورتوں کے حقوق کی دریافت کی رہی ہے۔ اس کی تیسری شکل مردوں سے مقابلہ آرائی کی ہے۔ شاعر اسلامی خواتین کو بیدار کرنا چاہتا ہے، لہٰذا انھیں مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

یہ کلب، یہ رقص گاہیں، یہ لب ساحل، یہ پارک
سارے چم خم ہیں یہ افرنگی تمدن کے فضول
تو چراغ خانہ تھی اب رونق محفل ہوئی
دے کے گوہر کر لیے تونے خزف ریزے قبول

گوہر دے کر خزف ریزہ قبول کر لینے کا مطلب ہے مغربیت کو گلے لگا کر مشرقیت سے ہاتھ دھو بیٹھنا۔ فضاؔ کے خیال میں ایسا کر کے عورت اپنے آپ کو گوہر نایاب سے ایک سستی جنس میں تبدیل کر رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مغرب کے عیار عفریت عورت کو بازارو بنا کر تماشا دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں ترقی کا سبز باغ دکھا کر ان کا استحصال کرنا چاہتے ہیں، وہ ان تک اپنی پہنچ کو اور ان کے حصول کو آسان بنانا چاہتے ہیں۔ شاعر خاتون اسلام کو ان کی انھیں شیطانیت سے باخبر کرا اپنے کو ارزاں بنانے سے روکنے کے لیے کہتا ہے ؎

اس قدر ارزاں نہ کر خود کو تو ہے ایسی متاع
سہل ہے جس کی طلب دشوار ہے جس کا حصول
عفت و ناموس کا گہوارہ ہے تیرا وجود
تو ہے اک خاتون مشرق، اس حقیقت کو نہ بھول

اقبال نے عورتوں کی قدر ومنزلت اجاگر کرتے ہوئے کہا تھا ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

اس میں کوئی شک نہیں کہ فضا اپنی ملی نظموں میں اقبال کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں اور اقبال کے تعلق سے وزیر آغا کا مندرجہ ذیل قول یہاں پیش کرنا حسب حال معلوم ہوتا ہے:

''جہاں تک اقبال کا تعلق ہے انھوں نے اسلاف کی عظمت کا تصور تو حالی سے اور مغربی تہذیب کی نفی کا تصور اکبر سے مستعار لیا اور یوں قطعاً غیر شعوری طور پر ایک بلند سطح پر آ کھڑے ہوئے۔''

فضا نے اقبال کی پیروی ضرور کی لیکن اپنے خیالات کی دنیا الگ بنائی۔ ڈائلاگ اور ڈائلکٹ کی سطح پر بھی وہ اقبال سے منفرد ایک نیا محل تعمیر کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اقبال کی طرح فضا بھی عورتوں کی قدر و منزلت سے بخوبی واقف ہیں اور خاتون اسلام کے مقام و مرتبہ اور ان کی عظمت کا انھیں پورا احساس ہے۔ اقبال نے عورت کے وجود سے ''تصویر کائنات میں رنگ'' کی بات کہی ہے۔ فضا نے عورت کے دم سے ''نظام کائنات میں توازن'' کی بات کہی ہے۔ شعر دیکھیں ؎

ہے ترے دم سے توازن میں نظامِ کائنات
تو اگر ہو مضطرب، کونین کی ہل جائے چول

یہی نہیں ان کے مقام و مرتبہ کا بیان کرتے ہوئے آگے کہتے ہیں ؎

چشم حوران بہشتی کے لیے سرمہ بنی
کیا کہوں کیا شے ہے تیرے نازنیں قدموں کی دھول
تیرے ماتھے کا پسینہ ہے کہ کوثر سلسبیل
ہے بہار خلد و طوبیٰ یا ترے آنچل کا پھول

ان کی عظمت کا بیان کرنے کے بعد فضا مشرقی تہذیب و تمدن کے گہوارے میں پلی کچھ ایسی ہستیوں کی مثال پیش کرتے ہیں جو اپنے آپ میں یکتا اور بے مثل ہیں۔ وہ زینب، مریم ہو کہ رابعہ بصری، سیدہ عائشہؓ ہو کہ فاطمہ زہرا یا خاتون اسلام کی پیدائش و تربیت سے پروان چڑھے انبیاء و رسل اور جنید و بایزید وغیرہ، سب مشرقی تہذیب اور اسلامی تمدن کی بلندی و عظمت کی نشانی ہیں۔ ان عظمت رفتہ کی یاد دہانی کراتے ہوئے خاتون اسلام کو مخاطب کر کے فضا آخر میں کہتے ہیں ؎

اس حقیقت سے نہیں شاید ابھی آگاہ تو
تجھ میں کوئی عائشہ ہے اور کوئی زہرا بتول

اس نظم کو پڑھ کر فضا سے متعلق پروفیسر عبدالمغنی صاحب کی کہی ہوئی بات لامحالہ یاد آ جاتی ہے۔ میں انہی کے قول پر اپنی بات ختم کرتا ہوں، قول ملاحظہ فرمائیں:

''آج کی طوفان مغرب میں فضا کی مشرقیت اپنی جگہ ایک مضبوط ستون کی طرح قائم ہے۔''

□□□

Mr. Mustafa Ali
Research Scholar
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
8299535742
mustafaaliias@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

چہرہ عرق عرق ہے ادائیں تھکی تھکی
نظارۂ جمال پشیماں نہ پوچھیے

یہ جمال لالہ و گل یہ فروغ صبح خنداں
وہ چمن میں مسکرائے کہ بہار مسکرائی

صفیہ شمیم

پیار کا روپ انوپ نرالا سو سو رنگ دکھائے
جیسے دوپٹا قوس وقزح کا آنکھوں میں لہرائے

میرا دل ہے کانچ کا ٹکڑا تیرا مکھ سورج کی کرن
ہائے تصور تیرا ظالم میرے دل سے ٹکرائے

سعیدہ عروج مظہر

جوڑا ہے میں نے خود کو تمھارے خیال سے
اب تو مرے فراق کو بدلو وصال سے

اس دل سے آرزوئیں تمنائیں سب گئیں
مل جاؤ تم تو سارا زمانہ مجھے ملے

بیگم رضیہ حلیم جنگ

آنکھوں میں روپ صبح کی پہلی کرن کا ہے
احوال جی کا زلف شکن در شکن کا ہے

لو کے موسم میں بھی دل انداز صبح کا چاہے
بات جس تس سے کرے ذکر تمھارا چاہے

ادا جعفری

تم تصور کے تراشے ہوئے پیکر ہو وہی
جس کو ہر رنگ میں دیکھا ہے سرابوں کی طرح

وہ ضیا تاب نظارے نہ وہ بھیگی راتیں
چاند افسردہ ہے اب ٹوٹے ہوئے دل کی طرح

زبیدہ تحسین

آنکھوں میں دیدار کا کاجل ڈالا تھا
آنچل میں امید کا تارا ٹانکا تھا

ہاتھ کی بانکیں چھن چھن چھن چھن ہنستی تھیں
پیروں کی جھانجھن کو غصہ آتا تھا

زہرا نگاہ

کیف جاں نور بصر یاد آیا
عرصۂ حرف و نہر یاد آیا

پھر بجھے دیپ کئی پلکوں پر
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

ساجدہ زیدی

بچھڑ کے سارے زمانے سے تم کو پایا ہے
بچھڑ کے رہ گئے تم بھی اگر تو کیا ہوگا

تمھیں گلہ ہے ادا ناشناس دنیا سے
ہمیں بھی غم ہے کہ اپنا مزاج داں نہ ملا

وحیدہ نسیم

ڈاکٹر خالدہ ناز

زخمی احساس

اپنے ضعیف وناتواں ابا کو قبر میں اتارتے وقت اس کے ذہن میں ایک عجیب سی آندھی چل رہی ہے۔قبرستان میں ہو کا عالم ہے۔بہت کم لوگوں کی موجودگی میں وہ اپنے ابا کو ان کی آخری آرام گاہ تک لایا تھا۔۔۔
اُسے تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ جس میّت کو یہاں تک لے کر آیا ہے اسے غسل بھی دلوایا گیا ہے اور کفن بھی نصیب ہوا ہے جبکہ پچھلے کچھ مہینوں سے تو ایسا ہو رہا ہے کہ زیادہ تر مردوں کو بس سپردِ خاک کر دیا گیا جسے ہاسپٹل والوں نے پی۔پی۔ای۔کٹ میں لپیٹ کر دیا اور بہت سے لوگوں نے یوں ہی ان کی آخری منزل تک پہنچا دیا۔نہ کسی کا انتظار نہ سفر کی تیاری۔

وہ جو بچپن سے کسی کی بھی موت کو بہت شدت سے محسوس کرتا آیا تھا اور اُس لمحے خود کو کافی بے چین پاتا تھا اس کے لیے اس وائرس نے جس طرح کی ناگہانی موت کا خوف دل میں بیٹھا دیا ہے اسے وہ کیسے بھول پائے گا۔اس وبائی مرض نے لوگوں کو جو درد دیا ہے اس سے لوگ نہ جانے کیسے باہر نکل پائیں گے۔شاید ہی کوئی ایسا انسان ہوگا جس کے ہاں کسی کی موت نہیں ہوئی ہوگی اور وہ خون کے آنسو نہیں رویا ہوگا۔کتنوں نے تو ماں اور ابا دونوں کو کھو دیا۔بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کے آخری دیدار سے بھی محروم رہے۔۔۔ایسے خوف زدہ ماحول میں جس نے دنیا کے ہر ایک شخص کو موت کی وحشت سے آشنا کروا دیا۔لیکن اسے بار بار یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا کہ اس کے ابا کچھ دن اور جی سکتے تھے۔ہمہ وقت اُس کے ذہن و دل میں یہ تکرار ہوتی رہتی کہ اگر کولکاتہ یا دہلی لے کر چلا جاتا تو جان بچ سکتی تھی۔۔۔لیکن اس لاک ڈاؤن میں جس طرح اُس نے ڈبل پیسے دے کر اپنے گھر تک کا سفر طے کیا تھا۔اس چھوٹے سے شہر میں وہ بھاگ دوڑ کرتا ہی رہ گیا اور ابا نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔گھنٹوں ان کا سر گود میں لیے وہ انگلیاں پھیرتا رہا تھا اور اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ جو سمجھ رہا ہے کہ ابا سو گئے ہیں درحقیقت وہ ابدی نیند سو چکے ہیں۔

اس کی بیوی جو اس کی حسّاس طبیعت سے واقف تھی اس کی دلجوئی کی حتی الامکان کوشش کرتی رہتی۔۔۔انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں موت کا ایک دن معین ہے۔یہی ناں کہ ابا اگر پہلے سے ہی آپ کے پاس آگئے ہوتے تو آپ انھیں بڑے ہاسپٹل لے جاتے۔لیکن ابھی ہاسپٹل کی جو صورتحال ہے وہاں جا کر تو بہت کم لوگ ہی زندگی کی جنگ جیت رہے ہیں۔اس وائرس نے تو اپنوں کو اپنوں سے دور کر دیا ہے جہاں مریضوں کے لیے تیمارداری سب سے بڑا علاج ہوتی ہے وہ اپنوں سے دور بغیر تیمارداری کے کس کسمپرسی کی حالت میں اپنی زندگی سے ہار مان رہے ہیں۔بس اللہ اب رحم کر دے۔آپ دعا کریں۔اللہ ہم سبھوں کو صبر دے۔اُس کی مرضی کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔۔۔۔یہ صحیح ہے نوشین لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ بندہ اپنی سی کوشش ضرور کرتا ہے۔۔۔تو کیا جو قبر میں پاؤں لٹکائے رہتے ہیں انھیں بھی اور جینے کی خواہش رہتی ہوگی۔اس کے دل نے سوال کیا اور وہ اپنے ابا کو منوں مٹی کے اندر سلانے کے ایک ہفتہ بعد بھی اس کا جواب نہ ڈھونڈ پایا۔جب اسے یہ احساس ہوتا کہ اس سے کوتاہی ہوئی ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

نوکری سے اس نے خود کو سبکدوش اختیار کر لی تھی۔چاہتا تو کچھ دن

اور ٹھہر سکتا تھا۔لیکن جب بہن کو اپنے بچوں کی آن لائن کلاسیز کی وجہ سے واپس جانا پڑا تو چھوٹے بھائی کے بہت اسرار پر بھی وہ مزید اس گھر میں نہیں رک سکتا تھا جہاں اسے اپنے ماں ابا کی موت کا نظارہ ایک پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔۔۔۔ماں جسے اس نے بہت چھوٹی سی عمر میں کھو دیا تھا لیکن اس کی موت کا منظر جوں کا توں اس کی آنکھوں میں موجود تھا۔

جب پاس بن گیا اور گاڑی آ گئی تو اس نے آبدیدہ نگاہوں سے اپنے گھر کو الوداع کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔لیکن یہاں آ کر بھی وہ اپنی بے چینی کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔جب آدھی آدھی رات کو اٹھ کر ٹہلنے لگتا تو نوشین پریشان ہو جاتی اور بڑے پیار سے سمجھایا کرتی۔خود آپ کی صحت بہت اچھی نہیں ہے۔بی۔پی کی دوا لیتے ہی ہیں میں نہیں چاہتی کہ نیند کی دوا بھی لینی پڑے۔اگر آپ اس طرح کریں گے تو چھوٹے چھوٹے پوتا پوتی کا کیا ہوگا بہو کے بارے میں سوچیں وہ خود اپنے بھائی کی وجہ سے پریشان ہے جسے کرونا ہو گیا ہے۔آپ کا بیٹا جو سات سمندر پار ہے خود اس کی نوکری داؤ پر لگی ہوئی ہے وہ آ بھی نہیں سکتا۔بیٹی نے آپ کی حالت دیکھی ہے وہ الگ پریشان ہوتی رہتی ہے۔فون پر تو آپ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ میں ٹھیک ہوں۔یہ صحیح ہے کہ ماں ابا کتنے ہی بوڑھے ہو جائیں ان کے گزرنے کے بعد ان کی کمی کا احساس ہوتا ہی ہے لیکن یہ بھی تو اٹل حقیقت ہے کہ ہم میں سے کوئی یہاں رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔سب کو اپنے مقررہ وقت پر جانا ہے۔ابا نے تو لمبی عمر پائی بس ان کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔یہ تو بس اس پاک پروردگار کو ہی معلوم ہے کہ کس کی موت کس جگہ اور کس حال میں ہوگی۔۔

"وہ نوشین کو کیا بتائے کہ اس کے اندر یہ تڑپ اور بے چینی کیوں ہے۔وہ اپنی زندگی میں کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرا ہے کبھی تو اس نے اپنے آپ پر قابو رکھ کر حالات کا مقابلہ کیا ہے اور کبھی خود کو بالکل تنہا اور بے بس محسوس کیا ہے۔ایسے وقت میں اسے اپنی ذات بھی غیر لگی ہے اور اب ...اب تو ابا کی موت نے اسے ماضی کا بھٹکا ہوا مسافر بنا دیا ہے"

وہ نوشین کو کیا بتائے کہ اس کے اندر یہ تڑپ اور بے چینی کیوں ہے۔وہ اپنی زندگی میں کیسے کیسے نشیب و فراز سے گزرا ہے کبھی تو اس نے اپنے آپ پر قابو رکھ کر حالات کا مقابلہ کیا ہے اور کبھی خود کو بالکل تنہا اور بے بس محسوس کیا ہے۔ایسے وقت میں اسے اپنی ذات بھی غیر لگی ہے اور اب۔۔۔اب تو ابا کی موت نے اسے ماضی کا بھٹکا ہوا مسافر بنا دیا ہے۔اُس ماضی کا جہاں سے اس کی زندگی نے گھٹ گھٹ کر اور غم پی کر جینے کی شروعات کی تھی۔تب سے آج تک تاحدِّ نظر کانٹے ہی کانٹے ہیں جس کی چبھن نے اسے کبھی چین سے جینے نہیں دیا ہے۔

اسے اچھی طرح یاد ہے جب اس کے ابا نے اسے شہر پڑھنے کے لیے بھیجا تھا اس وقت اس کی عمر سولہ سال تھی اس نے امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا تھا۔ابا بہت خوش تھے اور وہ آج تک نہیں سمجھ پایا تھا کہ ابا کی یہ خوشی اس کی کامیابی پر تھی یا اپنی دوسری شادی پر۔۔۔سو ایک عجیب سا بوجھ لیے وہ ہاسٹل میں اپنی ماں کی یادوں کے سہارے پڑھائی کرتا رہا۔بہت بلانے پر بھی وہ کسی نہ کسی بہانے سے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیتا۔اس کا گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔لیکن جب بی۔اے میں نمایاں کامیابی حاصل کی تو ابا کے بلانے اور سوتیلی ماں کے اسرار پر اسے گھر جانا پڑا تھا۔۔۔۔اماں ابا بہت خوش ہوئے تھے۔امّاں نے تو پورے محلے میں مٹھائی بٹوائی تھی۔چھوٹا بھائی بھی اب اسکول جانے لگا تھا اور چھوٹی بہن کی پیدائش چند ماہ قبل ہی ہوئی تھی۔کچھ دنوں تک گھر پر رہ کر وہ واپس ہاسٹل آ گیا تھا۔

۔۔۔۔وہ جیسے جیسے بڑا اور سمجھدار ہوتا گیا اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔لیکن گھٹ گھٹ کر جینا اس کی زندگی کا مقدر بن گیا تھا۔وہ چاہ کر بھی خود کو دنیا کے رنگ میں نہیں رنگ پا رہا تھا۔جبکہ کیسی سہولتوں کے ساتھ اس نے اپنی پڑھائی مکمل کی تھی۔بہترین کالج سے جرنلزم کا کورس کیا۔رہنے کے لیے ہاسٹل کا کشادہ کمرہ اور پھر کورس پورا ہوتے ہی اخبار میں کالم نگار کی نوکری۔

جب وہ اخبار کی دنیا میں آیا تو اسے زندگی کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔یوں تو اس نے بہت سارے معاملات کی گتھیوں کو اخبار کے ذریعہ سلجھایا تھا لیکن وہ وقت اسے اچھی طرح یاد ہے جب اخبار میں اسے لگاتار ایک کیس کے بارے میں کالم لکھنا پڑا تھا۔اپنے ملک کا کوئی رئیس آدمی جو اپنی لاعلاج بیماری سے تنگ آ کر خود کو ختم کر دینے کی وصیّت کر دیتا ہے۔اس کے لیے یہ انکشاف بالکل نیا تھا اور بہت ساری تحقیقات کے بعد اسے یہ علم ہوا تھا کہ باہر کے ملکوں میں جب انسان اذیت کی تاب لانے میں ناکام رہتا ہے اور تل تل اس کی زندگی موت سے ہم آغوش ہوتی رہتی

ہے اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ نہیں بچے گا تو ڈاکٹر اسے ابدی نیند سلا کر بہت مطمئن ہو جاتے ہیں جو خود مریض اور اس کے اپنوں کی مرضی سے ہوتا ہے۔۔۔اور جسے مرسی کیلنگ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔یعنی ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی کی۔لیکن چونکہ اپنے ملک میں اسے غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اس لیے کیس چل رہا تھا اور وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ بالکل غلط ہے۔۔۔۔۔اس نئی جانکاری نے اسے اور زیادہ مضطرب کر دیا تھا۔اس کے ذہن نے کئی مرتبہ اس سے کتنے سارے سوالات کیے تھے۔کیسے ایک مریض خود کو مارنے کے لیے کہہ سکتا ہے۔حالات چاہے کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں جینے کی خواہش تو آخری لمحوں تک ہوتی ہے۔پھر اس مریض کے بہت اپنے لوگ جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کی لمبی مسافتیں طئے کی ہوتی ہیں وہ کس دل سے ایسی اجازت دے سکتے ہیں۔وہ ہمیشہ سوچا کرتا زندگی قدرت کا حسین تحفہ ہے جو صرف ایک بار نصیب ہوتا ہے اسے ختم کرنے کا حق کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔

جب چھٹیوں میں وہ گھر جاتا تھا تو ابا کو دیکھ کر اس طرح کے واقعات اس کے ذہن کے پردے پر گھومنے لگتے۔اسے نفرت ہونے لگتی جب وہ اس کی سوتیلی ماں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہوتے تو وہ عجیب نگاہوں سے ان کو دیکھتا رہتا اور سوچا کرتا کہ انسان کس قدر خود غرض مخلوق ہے۔کسی کے مرنے جینے سے اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔جو دنیا میں زندہ رہتا ہے وہ اپنی زندگی کو رنگین بنا ہی لیتا ہے بس مرنے والا اپنی قیمتی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔لیکن وہ کسی نہ کسی کے دل میں تو ہمیشہ زندہ رہتا ہی ہے تب ہی تو وہ اپنی ماں کی موت کو اب تک نہیں بھول پایا تھا۔بارہ سال سے چودہ سال کی عمر تک اس نے اپنی ماں کو تل تل مرتے دیکھا تھا اور بڑھتی ہوئی عمر اور پختہ ہوتے ہوئے تجربے نے موت کے اس لمحے کو اس کے دماغ میں مقید کر دیا تھا۔اسے اچھی طرح یاد ہے کہ سب کچھ جلد ہی نارمل ہو گیا تھا۔صرف ایک سال بعد ہی ابا نے دوسری شادی کر لی تھی۔۔۔اپنے ہنستے مسکراتے اور زندگی کو بھر پور انجوائے کرتے ہوئے ابا کی زندہ دلی اس کے دل میں نفرت کے بیج کو تناور درخت بناتی چلی گئی اور وہ خود کو اپنے ماضی سے باہر ہی نہیں نکال پایا۔

حالانکہ اتنی چھوٹی سی عمر اس بات کو سمجھنے کی نہیں تھی لیکن اماں کی بیماری کے وقت اس نے بار بار ایسی باتیں گھر میں سنی تھیں جو اس کے دل میں نقش ہو کر رہ گئیں تھیں۔۔۔۔یہ بیماری ہے ہی جان لیوا۔امریکہ لندن کہیں بھی لے جاؤ۔کینسر کا علاج موت ہی ہے۔اکثر دیر رات تک ابا اور پھوپھی میں گھنٹوں بحث چل رہی ہوتی تو دوسرے کمرے میں ڈرا سہا وہ ساری باتیں غور سے سنتا رہتا۔۔ایک دن پھوپھی کی نصیحت جس پر ابا نے اماں کی موت تک عمل کیا تھا اس نے بڑے دھیان سے سنی تھی۔۔۔۔

۔۔۔۔۔بھیا یہ تو صحیح ہے کہ ابھی بھابھی کی عمر ہی کیا ہے۔لیکن کیا کیا جا سکتا ہے یہ بیماری ہے ہی ایسی خطرناک کہ دولت بھی لیتی ہے اور جان بھی۔۔۔۔۔علاج تو چل ہی رہا ہے اللہ کی مرضی ہوگی تو وہ یہاں کے علاج سے بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔

جس وقت اس کی ماں پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی وہ ماں سے لپٹ جاتا۔جانے اسے کیسی تکلیف تھی کہ وہ کراہتی رہتی تھی اور ایسے ہی کراہتے کراہتے ایک دن مر گئی تھی تب سے وہ بھی ہر ہر لمحہ مرتا رہا تھا۔۔۔۔یہی وجہ تھی کہ مرنے کا کوئی بھی واقعہ اسے اندر تک دکھی کر دیتا اور کئی کئی دنوں تک وہ بے چین سا رہتا۔اس کا حساس دل کسی ایسی موت کو دیکھ کر اور بھی تڑپ جاتا جس میں مریض کی موت علاج کی لاپرواہی سے ہوئی ہو۔۔اپنے ابا سے اتنا نفرت کرنے کے باوجود اسے یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اگر لاک ڈاؤن اور اس وائرس کا اتنا غیر متوقع اثر نہ ہوا ہوتا تو وہ اپنے ابا کا ضرور کسی اچھی جگہ جا کر علاج کرواتا۔کیونکہ یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ سب سے زیادہ خطرناک مریض کے علاج میں لا پرواہی برتنا ہے۔انسان سے جہاں تک ہو سکے وہ مریض کی سہولت کے لیے کرے۔اس کے علاج میں کسی طرح کی بھی کمی نہ کرے۔آگے موت اور حیات تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

صرف تین سال قبل جب اس کی سوتیلی ماں بیمار پڑی تھی اور چھوٹے سے شہر کے علاج سے وہ مطمئن نہیں تھا تو خود جا کر انھیں اپنے یہاں لے آیا تھا اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔لیکن یہ ابا کی بدقسمتی تھی کہ اتنے علاج کے بعد بھی وہ اپنی دوسری بیوی کو نہ بچا پائے تھے۔پر اسے یہ پچھتاوا نہیں ہوا تھا کہ اس نے علاج میں کوئی کمی کی ہے۔۔۔۔

۔۔جیسی اذیت سے اب وہ گزر رہا ہے کہ ابا کا علاج صحیح ڈھنگ سے نہیں کروا سکا ہے۔اگر اپنے ابا کو اماں کی موت کا قصوروار سمجھ رہا ہے تو خود کو ابا کی موت کا قصوروار۔۔۔۔۔وہ اس احساس کو کیا نام دے۔

□□□

Dr. Khalida Naz
New Colony
Islamnagar Bhatta
Bhagalpur-812001 (Bihar)
Mob: 7250069426

صائقہ غیاث

نرگس آپا

شبنمی قطرے مسلسل بوندوں کی شکل اختیار کرتے اور پھسل جاتے کار کی کھڑکی سے اب باہر دیکھ پانا مشکل تھا۔ میں سمٹ کر امی کے شانوں سے جا لگی مدھم نیند میں، میں نے خود کو وہاں پایا جہاں بے شمار نرگس کے پھول تھے۔ سبز میدان میں جہاں تک نظر جاتی وہاں صرف سفید نرگسی گلوں کا بسیرا تھا۔ ہارن کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی، نرگس آپا کا نام خود بہ خود لب پر آ گیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ایک بار پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

جب ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے، اس وقت تک بارش تھم چکی تھی۔ کار کا دروازہ کھلا سامنے استقبال کے لیے پورا خاندان کھڑا تھا یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں پورا گاؤں۔ سبھوں نے تمام چھوٹے بڑے بیگ اور سامان وغیرہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور گھر کے اندر جانے لگے ہمیں دیکھ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی گھر کے اندر آنگن میں بڑی سی چٹائی بچھائی گئی جو پھوس سے بنائی گئی تھی۔ ابا جان تو تمام مرد حضرات کے ساتھ باہر والے کمرے میں تشریف لے گئے ہمیں چٹائی پر بیٹھایا گیا۔ امی کے آس پاس چند بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں بیٹھ گئیں اور ان میں سے ایک خوش نما ہاتھ سے پنکھے کو جھلنے لگی۔ ہندوستان کے تمام گاؤں کے حالات یکساں ہی ہیں لہٰذا یہاں بھی بجلی مستقل نہیں بلکہ مہمانوں کی طرح آتی ہے۔ شادی میں شامل ہونے والے مہمانان کے علاوہ گاؤں کی بہت سی عورتوں اور لڑکیوں نے ہمیں گھیر رکھا تھا جو نہ جانے ایک دوسرے کے کانوں میں کیا کیا کہتیں اور مسکراتی جاتیں۔ مجھے سبھوں کا یوں دیکھنا پسند نہیں آیا میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگی، مگر بھابھی نے جھٹ ہاتھ کھینچ کر بیٹھا دیا وہ اپنے ساتھ ایک بڑا برتن لے آئیں اور اس میں امی کے پیر ڈال دیے ایک دوسری لڑکی پانی ڈالتی

جاتی۔ جب انھوں نے اپنا ہاتھ میرے پیروں کی طرف بڑھایا تو میں نے منع کر دیا انھوں نے ضد کی لیکن میں نے پیر نہیں دھلوائے ایک بار پھر وہاں موجود عورتوں نے نہ جانے کیا سرگوشی کی اور پھر سب ہنسنے لگیں میں فوراً کھڑی ہوئی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں یہ سوچتی رہی کہ آخر یہ کیسی رسم ہے؟ امی سے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ مہمانوں کے اسی طرح پیر دھلوائے جاتے ہیں یہ دراصل ان کی عزت افزائی کا ایک طریقہ ہے۔ دوبارہ اس تعلق سے کچھ نہیں سوچا کیونکہ اتنی بھیڑ میں مجھے تو صرف ایک ہی انسان سے ملنے کی خواہش تھی یعنی اپنی نرگس آپا سے جو سرسبز کھیتوں اور تالابوں کے درمیان ڈھلتے آفتاب کے نظارے سے بھی زیادہ پرکشش لگتی تھیں۔ ان کی سادگی میں ایک عجیب صوفیت تھی۔ اجلی رنگت، سنہرے بال، سرمئ آنکھیں، معصوم لہجہ اور گفتگو کا انداز ان جیسا شاید ہی کسی دوسرے کا ہو۔ میں نے انھیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ کوئی ان سے تلخ لہجے میں بات بھی کرتا تو وہ اس کا جواب بڑی نرمی اور مسکراہٹ سے دیتیں۔ پہلی ملاقات سے ہی میں ان کی مرید ہو چکی تھی۔ امی سے زیادہ میں ان کے پاس ہوتی ان کے ساتھ

"ابا جان مصروفیت کی وجہ سے ہمیں آپا کے گھر نہیں لے کر گئے۔ عرصے بعد جب ان کی شادی کی خبر آئی تو میں خوشی سے جھوم اٹھی، مگر یہ خوشی وقتی ثابت ہوئی کیونکہ جن دنوں ان کی شادی ہونے والی تھی انھی دنوں ہمارے دسویں کے امتحانات بھی تھے۔ یعنی میں چاہ کر بھی ان کی شادی میں شریک نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر آج ہم ملنے والے ہیں، اب ایسی کوئی وجہ یا مجبوری بھی ہمارے درمیان نہیں ہے"

سونا، اٹھنا، گھومنا پھرنا اور ان کے چھوٹے کام کر کے مجھے جو قلبی سکون ملتا اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی کتابوں کا مطالعہ وہ خوب کیا کرتیں، خود عمل کرتیں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتیں۔ ان کی باتوں کا اثر مجھ پر بھی خوب ہوا لیکن امی نے کتابوں کو واپس کروا دیا۔ وہ پردے کا خاص خیال رکھتیں ان کی بہت سی باتیں مجھے متاثر کرتیں وہ بالکل مختلف تھیں شاید ہی ان میں کسی طرح کی بھی کمی ہو۔ ان کے تعلق سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ کل اپنے شوہر کے ساتھ تشریف لائیں گی۔

ابا جان مصروفیت کی وجہ سے ہمیں آپا کے گھر نہیں لے کر گئے۔ عرصے بعد جب ان کی شادی کی خبر آئی تو میں خوشی سے جھوم اٹھی، مگر یہ خوشی وقتی ثابت ہوئی کیونکہ جن دنوں ان کی شادی ہونے والی تھی انھی دنوں ہمارے دسویں کے امتحانات بھی تھے۔ یعنی میں چاہ کر بھی ان کی شادی میں شریک نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر آج ہم ملنے والے ہیں، اب ایسی کوئی وجہ یا مجبوری بھی ہمارے درمیان نہیں ہے۔ میں یہی سب سوچتے ہوئے کب نیند کی آغوش میں چلی گئی مجھے یاد نہیں۔ تھکان کی وجہ سے دیر تک سوتی رہی حالانکہ اس درمیان گھر میں موجود عورتوں کے گیت سے نیند میں خلل ضرور آئی، مگر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں اس طرح جکڑ لیا تھا کہ اس خلل کا بھی اثر نہیں ہوا۔ میری نیند اس وقت کھلی جب نرگس آپا کی آمد سے گھر میں ایک الگ طرح کی ہلچل پیدا ہوئی۔ میں بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تو دیکھا سامنے ایک برقعہ پوش عورت کھڑی ہیں اور سلام و دعا کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ نرگس آپا تھیں۔ ان کی نگاہ جیسے ہی مجھ پر پڑی، انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

"کتنی بڑی ہوگئی ہے ثانیہ" انھوں نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا اور امی سے بات کرتی ہوئی کمرے میں آگئیں۔

میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی کمرے میں چلی آئی۔ جیسے ہی انھوں نے برقعہ اتارا، میں انھیں دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ مجھے لگا یہ نرگس آپا نہیں کوئی اور خاتون ہیں، سرمئ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ دھبے، ان سے کچھ اوپر ماتھے پر ایک لمبی بندی، سرخ ہونٹ، بڑے جھومر نما جھمکے جو گردن کو چھوتے ہوئے شانے تک آتے اور سرخ ساڑی جس میں ملبوس یوں تو وہ بہت خوبصورت اور جاذب نظر آرہی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں مجھے ایک اداسی نظر آئی، ایسا محسوس ہوا کہ یہ بناؤ سنگھار انھوں نے اپنی کسی تکلیف کو چھپانے کے لیے کیا ہے۔ میں نے چونکہ انھیں سادگی میں دیکھا تھا اور ان کا وہ روپ مجھے متاثر بھی کرتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ ان کا نیا روپ مجھے حیران کر گیا، پھر ان کی آنکھوں کی اداسی نے مجھے اندر سے بے چین کر دیا۔ میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ بار بار آپا کا خیال ذہن میں آتا رہا اور میں سوچتی رہی کہ آپا کیسے بدل گئیں اور ان کی آنکھوں میں موجود اداسی کی وجہ کیا ہے؟ میرا دل بے چین ہوگیا، میں اس سوچ سے نکلنا چاہتی تھی، یہ سوچ کر میں امی کے پاس چلی گئی جو گھر اور محلے کی عورتوں کے

ساتھ آنگن میں بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔

کل بارات تھی سبھی لڑکیاں اور عورتیں مہندی لگوانے اور لگانے میں مصروف تھیں۔ آپا خاموش بیٹھی ان سب کو دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھوں میں وہی عجیب سی اداسی تھی وہ بھیڑ میں بھی تنہا معلوم ہورہی تھیں۔ نہ جانے کیوں میں ان کے پاس چلی گئی۔ ایک دو رسمی بات کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ، میں انھیں مہندی لگادوں؟ پہلے تو انھوں نے منع کیا مگر میرے دوبارہ کہنے پر مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو میری جانب بڑھا دیا۔ مہندی لگواتے ہوئے وہ مجھ سے میری پڑھائی اور مشغولیات کے بارے میں بات کرتی رہیں۔ انھوں نے مسکرانے کی کوشش بھی کی مگر ان کی اداسی اس وقت بھی صاف طور پر نظر آرہی تھی۔ میں موقع کی تلاش میں تھی کہ باتوں باتوں میں ان کی اداسی کی وجہ پوچھوں، وہ آنکھیں جو نرگس کے تازہ پھولوں کی طرح تر و تازہ ہوا کرتی تھیں اب وہاں سیاہ سائے کیوں ہیں؟ جو آنکھیں اپنی چمک سے لوگوں کا من موہ لیا کرتی تھیں آج ان میں اداسی نے کیوں اپنا ڈیرہ جمالیا ہے۔

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے، اس سے پہلے کہ میں پیچھے مڑتی اس کی قہرناک آواز نے نہ صرف مجھے بلکہ وہاں موجود دوسری لڑکیوں کو بھی چونکا دیا۔

''یہ ضروری تھا۔''

آپا کانپ اٹھیں، لرزتی ہوئی آواز میں کہا''نہیں.... نہیں بس یوں ہی''

''یہاں آؤ''، بول کر وہ شخص وہاں سے چلا گیا۔

آپا مہندی دھو کر چلی گئیں۔ یہ آدمی کوئی اور نہیں آپا کے شوہر تھے۔ میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں کچھ سوچتی اس سے قبل موجود کسی عورت کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''نرگس کی تو زندگی برباد ہوگئی۔ بے چاری سب بیٹیوں میں سب سے حسین پر قسمت دیکھو۔

ہاں! قسمت ہی تو ہے۔ سنا ہے مارتا بھی ہے۔

مارتا ہے اور نشہ بھی کرتا ہے تمھیں شاید معلوم نہ ہو، بالکل نکما اور بیکار انسان ہے لیکن کیا کریں لڑکی والے ہیں مجبور ہیں۔''

قریب بیٹھی دو عورتوں کی یہ گفتگو نشتر کی طرح دل کو جا لگی۔ میں ان کے انتظار میں کافی دیر وہاں بیٹھی رہی لیکن وہ نہیں آئیں۔ رات کے کھانے کے وقت بھی آپا نظر نہیں آئیں۔

صبح سب تیاریوں میں مصروف تھے۔ بارات چند وقفے میں روانہ ہونے والی تھی ایک گوشے میں مجھے ایک خاتون نظر آئی جنھوں نے وہی ساڑی پہن رکھی تھی جو اس دن آپا پہن کر آئی تھیں۔ یہ آپا ہی تھیں جو مسکراتی ہوئی کاموں میں ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

''بارات کی روانگی پر کچھ دور تک تمام عورتیں بھی گیت گاتے ہوئے ہمراہ ہوگئیں لیکن میں چند منٹوں میں لوٹ آئی گھر میں داخل ہوتے ہی دوسرے کمرے سے کچھ آواز آئی، دیکھا تو بھابھی بستر کے ایک کنارے پر بیٹھی اشکوں کو مسلسل پوچھتیں اور نرگس آپا ان کی گود میں سر رکھے دل خراش آواز میں روئے جارہی تھیں۔''

بارات کی روانگی پر کچھ دور تک تمام عورتیں بھی گیت گاتے ہوئے ہمراہ ہوگئیں لیکن میں چند منٹوں میں لوٹ آئی گھر میں داخل ہوتے ہی دوسرے کمرے سے کچھ آواز آئی، دیکھا تو بھابھی بستر کے ایک کنارے پر بیٹھی اشکوں کو مسلسل پوچھتیں اور نرگس آپا ان کی گود میں سر رکھے دل خراش آواز میں روئے جارہی تھیں۔

''آپا.... نرگس آپا'' میں نے انھیں آواز دی اور ان کی طرف بڑھی تو انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان کے چہرے پر طمانچے کے نشان تازہ تھے وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں، میرا ضبط بھی جواب دے گیا اور میں بھی ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں آپا سے رونے کی وجہ کیا پوچھتی، ان کے آنسوؤں نے میرے ہر سوال کا جواب دے دیا تھا، ان کی نرگسی آنکھیں داستانِ غم کے ہر باب کو بیان کررہی تھیں۔ آپا روتے روتے سوگئیں۔ میں کچھ سمجھ نہیں پائی کہ کیا ہوا، لیکن بھابھی کا یوں رونا اور آپا کی خاموشی نے بہت کچھ بتا دیا۔

□□□

Ms. Saiqa Gayas
Masjid Mohalla Benachity
Post Benachity
Distt.Durgapur-713213 (West Bengal)
Mob:7001861188
E-mail:saiqagayas308gmail.com

حسنِ سخن

آشکارا خانم کشف

غزلیں

اک بحرِ مختصر میں کیا قافیہ بلند
ایسی غزل کہی کہ ہوا مرتبہ بلند

چہرے پہ تیرے داغ ہیں یا آئینہ بلند
تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند

تاریکیوں سے کہہ دو اندھیرے سمیٹ لیں
خورشید کر رہا ہے مرا زاویہ بلند

نا معتبر ہے وہ اسے باہر نکال دے
دل کو دیا دماغ نے یہ مشورہ بلند

جس وقت اس نے ختم کیا ہم سے رابطہ
ہم نے بھی مسکرا کے کیا حوصلہ بلند

کیوں خواب دربدر کیے اے چشمِ نیم باز
آواز ہو رہی ہے یہی جابجا بلند

بے شک کیا نہ تو نے عیاں دردِ دل مگر
احوال کہہ رہا ہے ترا قہقہہ بلند

تو بادہ خوار کشف ملامت پزیر تھا
غالب ترے سخن نے کیا مرتبہ بلند

(نوٹ: تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند غالب کا مصرع ہے)

وقت سے کھیل مگر وقت کے ماروں سے نہ کھیل
خاک ہو جائے گا اک روز شراروں سے نہ کھیل

غرق ہو جاتے ہیں کچھ لوگ لبِ ساحل بھی
موڑ دریا کا سمجھ اور کناروں سے نہ کھیل

مانا آنکھوں میں تری قوتِ گویائی ہے
یار لب بھی تو کبھی کھول اشاروں سے نہ کھیل

میں سراپا ہوں ترے سامنے اے شوخ نظر
اک نظر دیکھ مجھے چاند ستاروں سے نہ کھیل

بھول جا سارے ستم دورِ خزاں کے اے کشف
مستیاں لوٹ بہاروں کی تو خاروں سے نہ کھیل

Mrs. Aashkara Khanam Kashf
C/o. Suhaib Farooqui
Top Floor
Quresh Apartment
Lane No. 14, Ghaffar Manzil
Jamia Nagar
New Delhi 110025,
suhaib.farooqui@gmail.com

عارفہ افروز

آنسو کاغذ پر

میں اپنا درد اب
کس کو سناؤں
مری امی
مرا سونا یہ اجڑا گھر
مجھے اچھا نہیں لگتا
میں جب بھی روٹھتی تھی
تو مناتی آپ تھیں امی
میرا وہ روٹھنا
اب یاد آتا ہے مجھے امی
مجھے ملتی ہیں جب خوشیاں
تو دل میرا تڑپتا ہے
کہ اپنی یہ خوشی کی بات
میں کس کو سناؤں گی
میں اپنا دردِ دل
کس کو سناؤں اے مری امی
مجھے الجھن سی رہتی ہے
بہت بے چین رہتی ہوں
یہ الجھن اور بے چینی
اداسی، سوگواری سے
فضا بھی مضمحل سی ہے
میں اپنے دل کی ویرانی کا منظر
کس کو دکھلاؤں
وہ لمحے آپ کے سائے میں
جو بیتے ہیں
ماضی ہیں
وہ میٹھی ساعتیں اب بن کے نشتر
دل میں چبھتی ہیں
مجھے مجروح کرتی ہیں
مری امی
یہ دنیا کے کھلونے
ہیچ ہیں مجھ کو
کھلونوں کے لیے میں
آپ کو ناراض کرتی تھی
بہت ہی تنگ کرتی تھی
مگر امی
وہ ضد بچے کی تھی
بچے تو بس نادان ہوتے ہیں
کہاں باتیں سمجھتے ہیں
مری ضد سے خفا ہو کر
اکیلا کر دیا مجھ کو
یہ وعدہ عارفہ کا ہے
کہاں ہیں آپ
اے امی
میں یہ کیسے بتاؤں
آپ کا ہر حکم مانوں گی
نہ ہوں گی آپ تو
میں کس کو اپنا غم بتاؤں گی
مگر میرا یہ وعدہ ہے کہ
میں جی کر دکھاؤں گی
زمانے کو بتاؤں گی کہ میں
حوا کی بیٹی ہوں
نئی دنیا بساؤں گی
نئے گلشن سجاؤں گی
زمانے کو خوشی دوں گی
کوئی شکوہ نہیں ہوگا

Arifa Afroz
C/o. Azeem Ahmad
Pahalwan Katra Qasim Ganj
Bilariya Ganj
Azamgarh-276121 (U.P)

لذیذ پکوان

اسپرنگ ڈوسا

اجزا: ملی جلی سبزیاں، باریک کٹی ہوئی پیاز، ایک عدد ٹماٹر، آدھا پیالیکٹی لال مرچ، ایک چائے کا چمچہ پسا زیرہ، آدھا چائے کا چمچہ لہسن ادرک پیسٹ تیل، حسب ضرورت ماش دال پیسٹ، آدھی پیالی چاول پیسٹ، آدھا پیالی نمک، حسب ذائقہ

ترکیب: دال اور چاول بیسٹ میں نمک اور پانی ملا کر پتلا آمیزہ بنالیں اور سات سے چھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرم توے پر تھوڑا سا تیل لگا کر دال چاول کے آمیزے سے بہت سارے باریک سنہرے اور کڑ کڑے ڈوسا بنالیں۔ کڑاہی مھں تیل گرم کریں اور پیاز سنہری کرلیں۔ لہسن ادرک پیسٹ، ٹماٹر، لال مرچ، پسا زیرہ ڈال کر چند منٹ بھونیں۔ باریک کٹی سبزیاں اور نمک ڈال کر ہلکی آنچ پر نرم ہوئے تک پکائیں۔ جب سبزیاں تیار ہوجائیں تو ہرا دھنیا چھڑک کر مکس سبزی کو ڈوسا پر رکھ کر پیش کریں۔

موتی چور کے لڈو

اجزا: بیسن ایک پا، چینی ایک پاؤ، گھی ایک پاؤ، عرق گلاب آدھی چھٹانک، زعفران چار ماشہ پسی ہوئی

ترکیب: بیسن کو گاڑھا سا پھینٹ لیں۔ اس میں زعفران اور عرق گلاب ملا کر لڈو بنالیں۔ چینی میں آدھ پاؤ پانی ڈال کر شیرہ پکالیں۔ فرائنگ پین میں گھی کو خوب گرم کریں اور لڈو ڈال کر تلتے جائیں اور ساتھ ہی ساتھ تیار شدہ شیرے میں ڈالتے رہیں۔ گھنٹہ بھر پڑا رہنے دیں۔ شیرہ جذب ہو جائے گا اور ذائقے دار لڈو تیار ہوں گے۔

چکن اچار بن کباب

اجزا: بن چار عدد (سینکے ہوئے) مرغی کا قیمہ آدھا کلونڈپ اچار 1/4 پیالی، آلو بڑے دو عدد، سلاد پتہ، پیاز، ٹماٹر، سجاوٹ کے لیے نمک، حسب ذائقہ تیل تلنے کے لیے

ترکیب: مرغی کے قیمے میں اچار اور نمک مکس کر کے کباب بنالیں۔ فرائنگ پین میں تھوڑا تیل ڈال کر دونوں طرف سے سرخ کرلیں۔ اچاری کباب کو بن پر رکھیں پھر تلے آلو سلاد پتہ، پیاز اور ٹماٹر سے سجا کر دوسرے آدھے بن سے ڈھک دیں۔ توے پر تھوڑا مکھن ڈال کر گرم کریں اور اس اچاری بن کباب کو چند سیکنڈ کے لیے سینک لیں اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

ایگ پلانٹ چپس

اجزا: بینگن کلو (گول والے) نمک حسب ذائقہ چاٹ مصالحہ ایک کھانے کا چمچ قصوری میتھی ایک کھانے کا چمچ املی کا پیسٹ دو کھانے کے چمچے، کارن فلور کپ تیل دو کپ

ترکیب: بینگن کے گول سلائس کاٹ کر ٹھنڈے پانی میں ڈال دیں۔ ایک پیالے میں نمک، چاٹ مصالحہ، قصوری میتھی، املی کا پیسٹ اور کارن فلور ڈال کر مکس کریں۔ کڑاہی میں درمیانی آنچ پہ تیل گرم کریں۔ بینگن کے سلائسز کو پانی سے نکال کر خشک کرلیں اور تیار کیا ہوا مصالحہ لگا کر خوب اچھی طرح مکس کریں اور گرم تیل میں ڈال کر فرائی کریں اور کرسپی ہونے پر نکال لیں۔ مزیدار ایگ پلانٹ چپس تیار ہیں کیچپ کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

□□□

مشکور احمد

پیشہ ورانہ سرطان
(Occupational Cancer)

صنعتوں میں یہ ایک شدید مسئلہ ہے۔ جسم میں عموماً جلد، پھیپھڑے، پیشاب کی تھیلی اور خون کی تولید کرنے والے اعضا وغیرہ متاثر ہوتے ہیں اور سرطان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

(1) جلدی سرطان (Skin Cancer)

پرسیل پوٹ پہلا سائنسداں تھا جس نے سب سے پہلے چمنی میں جھاڑو دینے والوں میں 1775 میں کیسہ خصیتین (Scrotum) کا سرطان تشخیص کیا اور یہ پتہ لگایا گیا کہ جلد اور (Scrotum) کا سرطان تارکول (Coal Tar)، ایکسرے، کچھ تیل اور رنگوں (Dyes) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آج شماریات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاروباری سرطان میں تقریباً 75 فیصد جلد کے سرطان ہوتے ہیں۔ سرطان جلد کاروبار سے لاحق ہونے والی بیماری ہے جو عموماً گیس کا کام کرنے والے کوئلہ، تار (Tar) کو چھاننے والے، شراب کے کارخانے، تیل کو صاف کرنے والے، رنگ کے مادے (Dye Stuff) بنانے والے، سڑک بنانے والے اور معدنی روغن، قیر (Pitch) وغیرہ سے متعلق صنعتوں میں کام کرنے والے لوگوں میں ہوتی ہے۔

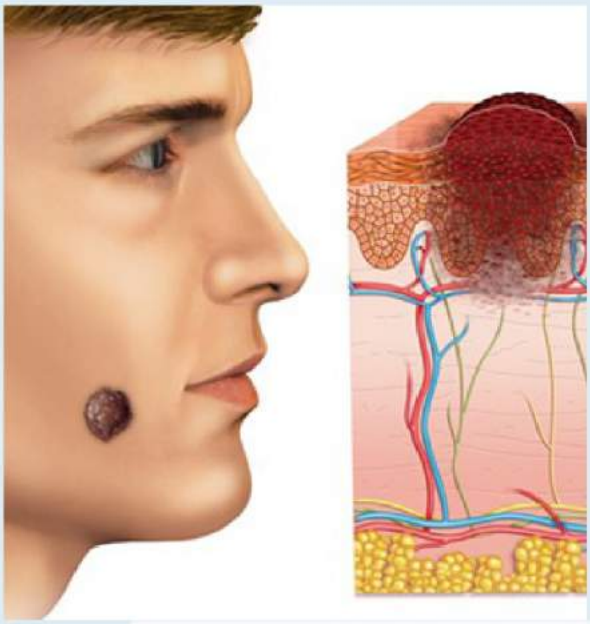

(2) سرطان ریوی (Lung Cancer)

پھیپھڑوں کا سرطان عموماً گیس، حریر صخری (Asbestos) کی صنعت، نکل (Nickel) اور کرومیم (Chromium) کے کام، سنکھیا کو کشتہ کرنے کے کارخانے، ریڈیائی اشیا اور یورنیم (Uranium) کی کانوں میں کام کرنے والوں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ تحقیق شدہ بات ہے کہ کرومیم (Chromium)، حریر صخری (Asbestos) تارکول، ریڈیائی (Radioactive) مادے اور سگریٹ نوشی سرطان الریہ پیدا کرتے ہیں۔ سنکھیا (Arsenic)، بیریلیم (Beryllium) اور آئیسو پروپائل (Iso Propyl) تیل ممکنہ سرطان پیدا کرنے والے ہیں۔ دس میں سے نو سرطان الریہ تمباکو نوشی، ہوائی آلودگی اور کاروباری اثرات کے سبب ہوتے ہیں۔

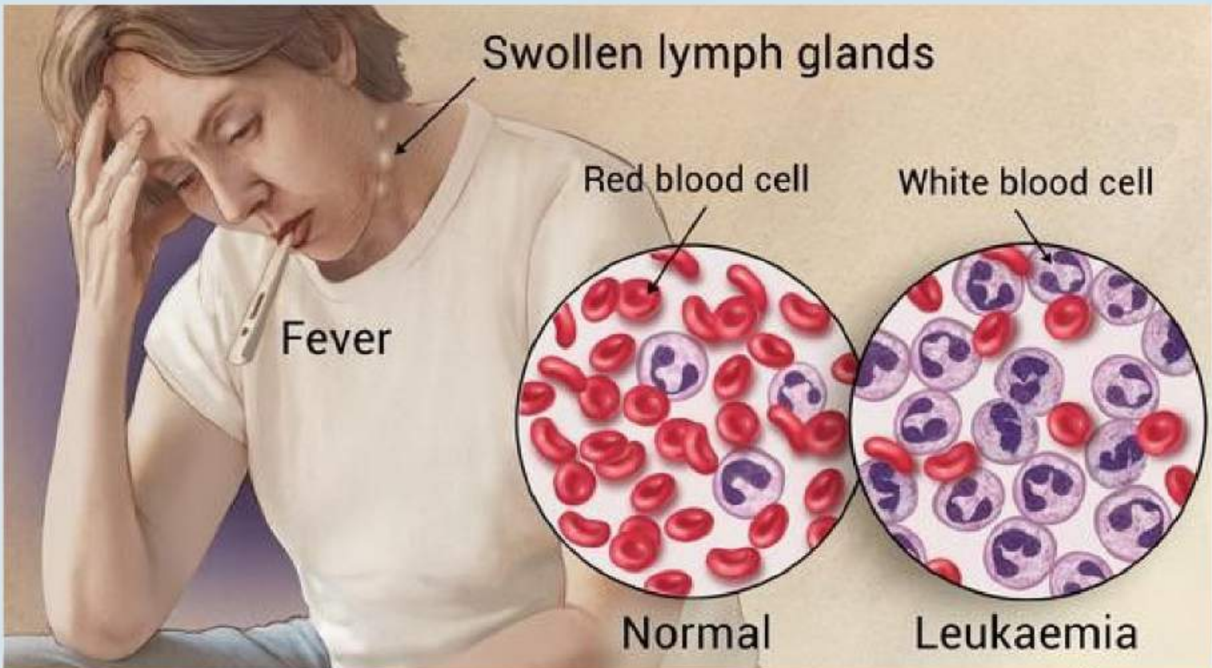

(3) پیشاب کی تھیلی کا سرطان (Bladder Cancer)

پیشاب کی تھیلی کا سرطان سب سے پہلے 1895 میں اینیلین (Aniline) کی صنعت میں کام کرنے والوں میں پایا گیا۔ حال ہی میں چند سال قبل یہ ربر کی صنعت میں کام کرنے والوں میں بھی پایا گیا ہے۔ آج یہ تحقیق شدہ ہے کہ پیشاب کی تھیلی کا سرطان عطری امائنات (Aromatic Amines) کی وجہ سے ہوتا ہے جو کہ جسم میں مستحیل ہو کر پیشاب میں خارج ہوتے ہیں۔ اس بیماری سے متعلق رنگ کے استعمالات (Dye Stuffs)، ربر، گیس اور بجلی کے تاروں (Electric Cable) کی صنعتیں شامل ہیں۔ درج ذیل ممکنہ اشیا پیشاب کی تھیلی میں سرطان پیدا کرنے والے ہیں۔ بیٹا نیپتھائیلما ئین (Betanaphthylamine)، بینزیڈین (Benzidine)، پیراامائینو ڈائی فنائل (Paraamino Diphenyl)، میجنٹا (Magenta) اور اوریما ئین (Auramine) وغیرہ

(4) سرطان الدم (Leukaemia)

بینزول (Benzol)، رونٹجین (Roentgen) شعائیں، اور ریڈیائی (Radio-Active) مادے سے متاثر ہونے پر سرطان الدم (Leukaemia) ہوسکتا ہے۔ بینزول (Benzol) ایک بہت خطرناک مادہ ہے جو بہت سی صنعتوں میں محلول (Solvent) کے طور پر مستعمل ہے۔ تعرض ختم ہونے کے بہت دنوں بعد بھی سرطان الدم لاحق ہوتا ہے۔ کاروبار سے متعلق سرطان کی خصوصیات ذیل ہیں۔

(i) یہ لمبی مدت کے تعرض کے بعد لاحق ہوتے ہیں۔

(ii) تعرض اور سرطان کے درمیان کا وقفہ بہت لمبا یعنی 10 سے 25 سال تک ہوسکتا ہے۔

(iii) بیماری تعرض (Exposure) کے ختم ہونے کے بعد بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

(iv) دوسرے سرطانوں کے مقابلہ میں یہ ان سے کچھ کم عمروں میں ہوتا ہے۔

(v) مخصوص کاروبار کے سرطان کی جائے وقوع عموماً مخصوص اور ایک ہی پائی گئی ہے۔

صنعتوں کے سرطان سے روک تھام

(1) صنعتوں کے سرطان پیدا کرنے والے مادوں کو ختم کیا جائے یا ان کی روک تھام کی جائے۔ تکنیکی عوامل مثلاً صنعتوں سے کلیتاً سرطان پیدا کرنے والے مادوں کا اخراج، اچھے طریقہ پر بنائی گئی عمارت اور مشینیں، پیداوار کا نظام محفوظ اور بند (Enclose) ہو۔

(2) صنعتوں کا معائنہ،

(3) اطلاع (Notification)،

(4) طبی معائنہ،

(5) صنعتوں کے لائیسنس،

(6) شخصی حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی،

(7) مزدوروں اور متعلق اشخاص کی تعلیم اور

(8) مسلسل تحقیق۔

کاروباری التہاب جلد (Occupational Dermatitis)

صنعتوں میں یہ ایک بڑی صحت کی پریشانی ہے اس کے اسباب ذیل ہیں۔

(i) طبعیاتی (Physical): حرارت، برودت، نمی، رگڑ، دباؤ، وخراش، ایکس رے (X-rays) اور دیگر شعائیں۔

(ii) کیمیاوی (Chemical): مختلف تیزاب، الکلی، رنگ (Dyes) محلول، گریس، تارکول، قیر، (Pitch) کلو رینیٹڈ فینول (Chlorinated Phenol) وغیرہ

(iii) حیاتیاتی (Biological): زندہ ذرائع مثلاً وائرس، جراثیم، پھپھونداور دیگر طفیلیات (Parasites)، نباتی ماخذ مثلاً پتیاں، سبزیاں، پھل پھول، سبزیوں کا کچرا وغیرہ۔

تدابیر: اس سے آسانی سے بچاؤ کیا جاسکتا ہے اگر مناسب تدابیر اختیار کر لی جائیں۔

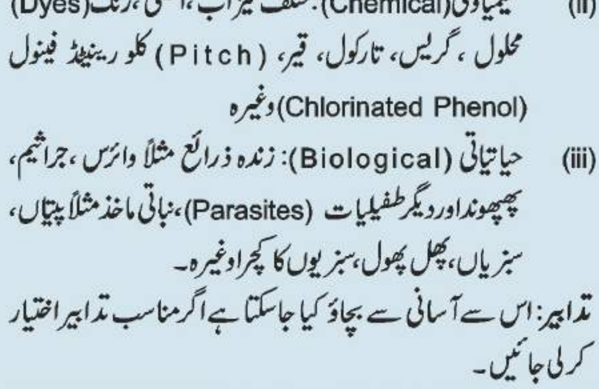

(i) انتخاب سے قبل (Pre-selection): نوکری دینے سے قبل مزدوروں کا معائنہ کرلیا جائے اور جن لوگوں میں التہاب جلد (Dermatisis) کے امکانات پائے جائیں یا جن میں پہلے سے ہی جلدی امراض ہیں انھیں ایسی نوکریوں سے دور رکھا جائے کیونکہ اس سے جلدی امراض کا خطرہ ہو۔

(ii) حفاظت (Protection): مزدوروں کی مکمل حفاظت کی جائے یعنی انھیں مناسب کپڑے لمبے لمبے چمڑے کے دستانے، کوٹ (Aprons) اور جوتے دیے جائیں۔ کپڑوں کی صفائی ستھرائی وقت پر ہو اور انھیں اچھی طرح رکھیں۔ مخصوص رکاوٹ پیدا کرنے والی کریم (Barrier Cream) کا استعمال کرایا جائے۔

(iii) شخصی حفظان صحت: صابن، صاف تولیے اور وافر مقدار میں گرم پانی دستیاب ہونا چاہیے اور مزدوروں کو ان چیزوں کے استعمال کی طرف بار بار ابھارا جائے۔ صنعتوں میں مناسب نہانے دھونے کی سہولت کی فراہمی فیکٹری کے قانون کے تحت لازمی ہے۔

(iv) وقفہ وقفہ سے معائنہ: کاروباری التہاب جلد (Dermetitis) اس کی فوری تشخیص اور مناسب علاج کے لیے وقفہ وقفہ سے تمام مزدوروں کا طبی معائنہ بھی کیا جائے۔ اگر مناسب ہو تو متاثرہ مزدوروں کو ایسے کاروبار میں منتقل کردیں جہاں ان کو کاروباری التہاب جلد (Occpational Dermetitis) کے امکانات نہ رہیں۔ کام کرنے والوں کو یہ ہدایت دی جائے کہ وہ جلدی خراش کی اطلاع دیں تا کہ پتہ کیا جاسکے وہ کتنی کم اور معمولی نوعیت کی ہے۔

(ماخذ: مشکور احمد، ماحولیات وصحت تاریخ وارتقا، حفظان صحت، سن اشاعت 2018)

حسن کی نگہداشت

جلد کے لیے ٹپس

1۔ایک چمچ چندن پاؤڈر میں ایک چٹکی ہلدی اور ایک چمچ دودھ ملا کر گاڑھا پیسٹ تیار کریں۔اس پیسٹ کو چہرے پر لگائیں۔قریب بیس منٹ بعد چہرا صاف کرلیں۔اس سے چہرے پر نکھار آتا ہے۔

2۔ایک چمچ تازی کریم میں تین چار بادام مہین پیس کر ملائیں۔ اس میں چار پانچ بوند نیبو کا رس ملا کر پیسٹ بنائیں۔اس پیسٹ کو چہرے اور گردن کے آس پاس لگائیں۔قریب بیس منٹ بعد ہلکے ہاتھوں سے ملتے ہوئے اسے صاف کرلیں۔اس سے خوبصورتی میں نکھار آتا ہے۔

3۔ پپیتے کے گودے کو اچھی طرح مسل کر چہرے، گردن اور ہاتھوں پر لگانے سے آسانی سے داغ دھبے دور ہوجاتے ہیں۔

4۔ایک چمچ چاول کا آٹا لے کر اس میں دو چمچ گاڑھا دہی ملا کر پیسٹ بنالیں۔اسے چہرے اور ہاتھوں پر لگا کر ہلکے ہاتھ سے ملیں۔ پانچ سات منٹ بعد صاف کرلیں۔

5۔تین چمچ چوکر، ایک چمچ بیسن، ایک چمچ شہد، ایک چمچ دہی اچھی طرح ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ کو چہرے پر قریب بیس منٹ لگا رہنے دیں۔بعد میں صاف کرلیں۔

6۔ایک چمچ سفید تل میں ایک چمچ ہلدی ملا کر گاڑھا پیسٹ بنا لیں۔اس پیسٹ کو چہرے پر ابٹن کی طرح لگائیں۔ چہرہ میں چمک آئے گی۔

7۔اگر آپ کی جلد روکھی رہتی ہے تو رات میں سونے سے پہلے بادام یا ناریل کے تیل سے چہرے اور ہاتھ پیر کی مساج کریں۔پھر کھیرے کے ٹکڑے کاٹ کر ملیں۔بعد میں صاف کپڑے سے اچھی طرح چہرے اور ہاتھ پیر صاف کرلیں۔

8۔روکھی جلد کی پریشانی دور کرنے کے لیے تین چمچ شہد میں ایک چمچ بادام کا تیل، ایک چمچ زیتون کا تیل ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔اسے اپنی جلد پر قریب آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ بعد میں ہلکے گنگنے پانی سے جلد صاف کریں۔

9۔نیبو کے چھلکوں کو سکھا کر اس کا پاؤڈر بنالیں۔اس میں ایک چمچ ہلدی اور تھوڑا سا دودھ ملا کر پیسٹ بنالیں۔اسے اپنی جلد پر لگائیں اور کچھ دیر بعد اسکرب کی طرح رگڑ کر چھڑائیں۔اس سے جلد میں چمک آتی ہے۔

10۔تین چمچ باجرے کے آٹے میں چار پانچ چمچ دودھ اور ایک چمچ گلسرین ملا کر پیسٹ بنالیں۔اسے قریب پانچ منٹ تک چہرے پر لگا

رہنے دیں۔ بعد میں ابٹن کی طرح رگڑ کر چھڑائیں۔

11۔ دو چمچ ٹماٹر کے رس میں چار چمچ دہی ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اسے اپنے چہرے اور گردن کے آس پاس لگائیں۔ کچھ دیر بعد صاف کر لیں۔

12۔ تھوڑے سے چرونجی کے دانوں کو رات بھر کے لیے دودھ میں بھگو کر رکھ دیں۔ صبح انھیں پیس کر اس میں تھوڑی سی ہلدی ملا لیں۔ اس مکسچر کو چہرے پر لگائیں۔ اس سے چہرے پر نکھار آتا ہے۔

13۔ کیلے کے گودے کو مسل کر اس میں تھوڑا سا شہد ملا کر چہرے پر لگائیں۔ یہ قدرتی مائشچرائزر کا کام کرتا ہے۔

14۔ چہرے پر نکھار لانے کے لیے ٹماٹر، کھیرے یا سنترے کا رس لگائیں۔ یہ جلد کے لیے ٹانک کا کام کرتا ہے اور ان سے جلد میں چمک آتی ہے۔

15۔ ایک چمچ چنے کی دال کو دودھ میں رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ صبح پیس کر اس میں ہلدی، ملائی اور دو تین بوند گلاب جل ملا کر چہرے پر لگائیں۔ سوکھنے پر ہلکے ہاتھوں سے رگڑ کر چھڑائیں۔ اس سے چہرے پر رونق آتی ہے۔

خوبصورتی بڑھانے کے لیے کارآمد نسخے

دودھ: ہر دن چہرے پر روئی کے پھاہے سے کچا دودھ لگانے پر چہرے پر موجود ڈارک اسپوٹس ہلکے ہو جاتے ہیں۔ بعد میں چہرے کو ہلکے گنگنے پانی سے صاف کر لیں۔

آلو: کچے آلو کا رس نکال کر جلد پر لگانے سے داغ دھبوں سے راحت ملتی ہے۔ آلو میں موجود پوٹیشیم سلفر، فاسفورس اور کیلشیم جلد کی صفائی میں مدد کرتا ہے۔

کچے آلو کو کاٹ کر آنکھوں کے نیچے ہر دن تھوڑی دیر ملنے سے آنکھوں کے نیچے کا کالا پن دور ہوتا ہے اور جلد کی رنگت بھی نکھرتی ہے۔

تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ آلو کا رس بالوں کے لیے کافی فائدے مند ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ مقدار میں اسٹارچ پایا جاتا ہے، جس سے بالوں میں موجود زیادہ تیل صاف ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں کچے آلو کے رس سے بالوں کو دھونے پر بال مضبوط ہوتے ہیں۔

سنترا: چہرے پر ہر دن سنترے کا تازہ جوس لگانے سے نکھار آتا ہے۔ سنترے کے چھلکوں کو تھوڑے سے پانی کے ساتھ اچھی طرح پیس کر پیسٹ بنا لیں۔ اس پیسٹ کو چہرے پر لگانے سے مہانسوں کی پریشانی دور ہوتی ہے۔

اگر آپ کی جلد روکھی ہے تو سنترا ایک بہترین مائشچرائزر کا کام کرتا ہے۔ ایک چمچ سنترے کے جوس میں آدھا چمچ شہد اور ایک چمچ ملتانی مٹی ملا کر پیسٹ بنا لیں۔ اسے چہرے پر لگا کر قریب 15 منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ بعد میں صاف کریں۔

سیب: ایک سیب لے کر اسے اچھی طرح مسل لیں۔ اسے چہرے پر فیس پیک کی طرح لگائیں۔ اس سے جلد میں نکھار آتا ہے۔ ساتھ ہی کساؤ بھی آتا ہے۔

سیب کی ایک سلائس کاٹ کر اسے دانتوں پر ملنے سے دانتوں میں چمک آتی ہے۔

اناناس: چہرے پر تازہ اناناس جوس لگانے سے جلد میں نکھار آتا ہے۔ بہتر نتیجے کے لیے اسے دن میں کئی بار لگائیں۔

ایک کپ دودھ میں دو چمچ شہد ڈال کر ملا لیں۔ اس میں کچھ اسٹرابیری بھی میش کر کے ملا لیں۔ انھیں اپنے بالوں پر لگائے اور دو گھنٹے بعد شیمپو سے بال دھو لیں۔

2 انڈوں کو ایک باؤل میں پھوڑ لیں، اب اس میں آلیو آئل مکس کر لیں۔ اس سے اپنے بالوں اور سر کی جلد پر مالش کریں۔ ایک گھنٹے تک بالوں میں لگائیں رکھنے کے بعد شیمپو کر لیں۔ اس سے آپ کے بال اسٹریٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ملائم اور چمک دار بھی ہو جائیں گے۔

ایک باؤل میں ناریل کا دودھ اور لیمو کے رس کو برابر مقدار میں ملا لیں۔ اب اسے اپنے بالوں میں لگائیں۔ 15 منٹ بعد گنگنے پانی سے اپنے بال دھو لیں۔ ہفتے میں دو بار اس ترکیب کو اپنانے سے آپ کے بال ملائم اور اسٹریٹ ہو جائیں گے۔

(بحوالہ: www.jagran.com)

تاثرات: نگر نگر سے

کسی زمانے میں نئی دہلی سے شمع گروپ کی جانب سے ماہنامہ بانو شائع ہوتا تھا، اس کے علاوہ خاتون مشرق اور دیگر رسائل نکلتے تھے مگر جدید ٹکنالوجی کے دور میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ادبی رسالہ اردو دنیا، سہ ماہی 'فکر و تحقیق اور بچوں کی دنیا کے بعد خواتین کے لیے پانچ سال قبل رسالہ خواتین دنیا کا اجرا عمل میں آیا اور ہندوستان سے نکلنے والے تمام رسالوں میں یہ خوبصورت دلکش ملٹی کلر ہے اور معیاری بھی۔

زیر نظر شمارہ اگست 2021 جلد 5 شمارہ 8 ہے۔ 64 صفحات کے اس رسالے میں 18 نگارشات شامل ہیں۔ مشعل عنوان کے تحت مدیر لکھتے ہیں:

''جنگ آزادی میں صرف خواتین نے ہی بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیا بلکہ اس میدان میں ایسے شاعر بھی آئے جنھوں نے خواتین کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ مجاز نے کہا:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

دوسری طرف کچھ خواتین ایسی بھی تھیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام کے دلوں میں آزادی کے جذبے کو بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

کچھ ایسی بات کریں اپنی دست گیری سے
جو قید میں ہیں پڑے وہ چھٹیں اسیری سے

شخصیت کے تحت: ڈاکٹر ہاجرہ بانو کا مضمون ''فکشن کا کوہ نور: قاضی عبدالستار'' ہے۔ یہ ایک عظیم شخصیت تھی۔ انھوں نے ایک زرین ادبی عہد کو سمیٹ کر راہ بتائی۔

نکہت سخت، ص 8 پر شاعرات کے منتخب اشعار ہیں۔

ماہ اگست کے اعتبار سے تحریک آزادی کے تحت دو مضامین ہیں جس میں ایک مضمون 'جنگ آزادی کی ایک گمنام مجاہدہ: آسیہ خاتون میواتی' ڈاکٹر محمد مشتاق تجاوری کا ہے۔ آزادی میں خواتین کی خدمات کا جائزہ ہے۔ دوسرا آزادی کا نغمہ 'صبح وطن' کی روشنی میں ڈاکٹر فرزانہ خلیل نے چکبست کی نظم کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

جہان نسواں کے تحت تین مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'اردو میں خواتین کے تحقیقی موضوعات' ڈاکٹر محمد شمس الدین کا ہے خواتین نے جو کام کیے ہیں اس کا انھوں نے سرسری جائزہ لیا ہے۔ جبکہ اس پر مستقل لکھا جا سکتا ہے۔ دوسرا مضمون 'اختر الایمان کی نظموں میں روحانی عناصر'، نہاں کا مضمون خوب ہے انھوں نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے ساتھ ہی نظم نگاری کا تنقیدی تجزیہ بھی کیا ہے۔ اختر الایمان کی نظم کا یہ بند دیکھیے:

اس کا ہاتھ ہاتھوں میں
لے کے جب میں کہتا تھا
اب چھڑاؤ تو جانوں

تیسرا مضمون 'محمد علوی کی شاعری میں پیکر تراشی' شفا مریم کا ہے۔ بڑے ہی اچھے انداز میں انھوں نے ان کی شاعری میں جو پیکر تراشی کو پیش کیا ہے وہ نئے انداز میں ہے کیونکہ جو پیکر علوی کے پاس ہے وہ دوسروں کے پاس نہیں۔ گوشۂ ترنم ریاض میں چار مضامین اس طرح ہیں

☆ترنم ریاض کا افسانہ 'یہ تنگ زمین': ڈاکٹر عرشیہ جبیں

☆ترنم ریاض کی نظمیہ شاعری کی فکری جہتیں: محمد عارف

☆ترنم ریاض بحیثیت ناول نگار: امتیاز احمد

☆ترنم ریاض کا ناول 'برف آشنا پرندے': مختار احمد

مضمون نگاروں میں الگ الگ موضوعات پر ترنم ریاض کے افسانوں ناول اور نظموں پر لکھا، اردو ادب میں ترنم ریاض کا ایک مقام ہے وہ شعر و ادب میں شاعری، افسانہ نگار، ناول نگار، محقق و ناقد کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ ان پر گوشہ گویا نئے قلمکاروں کی پذیرائی کرتا ہے کیونکہ یہ 1980 کے بعد ابھرنے والی خاتون قلمکاروں میں سے ہیں۔ اس میں ان کی چالیس سالہ ادبی خدمات کا احاطہ ہے۔

انشائیہ 'لپ اسٹک' کا جواب نہیں۔ ڈاکٹر زیبا ناز نے خواتین کی ان حرکتوں کو پیش کیا ہے۔ اور کس کس طرح سے لپ اسٹک کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جملہ ملاحظہ کیجیے:

''اکثر ایسا بھی دیکھا گیا کہ شادی یا تکلف کی محفل میں خواتین جلسہ گاہ کے کسی کونے میں خود کو محفوظ کر کے اپنی لپ اسٹک درست کر رہی ہیں۔

لپ اسٹک کے اس خوبصورت انشائیہ کے بعد حسن سخن کے تحت ڈاکٹر مردلا گھئی کی آزاد نظم یا نثری نظم ایک نیا انداز لیے ہوئے ہے۔ آرائش و زیبائش کے تحت 'چہرے کی خوبصورتی کے آسان نسخے' یاسمین بانو کا ہے جس میں حسن کی نگہداشت کے لیے آسان نسخے بتائے گئے ہیں۔

باورچی خانہ کے تحت لذیذ پکوان چکن بھنڈی مسالہ، چپلی کباب، مٹن پلاؤ وغیرہ کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

تاثرات کے تحت خطوط ہیں۔ آخر میں خواتین خبر نامہ ہے جس میں خواتین کے کارناموں کو بتایا جاتا۔

یہ رسالہ نہ صرف خواتین کے لیے بلکہ ادب کے شائقین کے لیے ایک سوغات ہے اس رسالہ کو صرف 10 روپے میں حاصل کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر م۔ ق۔ سلیم، صدر شعبہ اردو شاداں کالج، حیدر آباد، تلنگانہ

''خواتین دنیا'' جولائی 2021ء ہمدست ہوا۔ ماں کی گود ہر بچہ کے لیے گہوارہ ہوتی ہے، جس میں وہ ہمکتا ہے، پنپتا ہے، پرورش پاتا ہے، مادری زبان سیکھتا ہے اور ماں سے بہتر کوئی بھی بچہ کی باڈی لینگوج کو سمجھ نہیں سکتا۔ بچوں کی عملی نفسیات سے مائیں ہی سب سے زیادہ واقف ہوتی ہیں اس لیے کوئی تعلیم یافتہ ماں ہی 'ادبِ اطفال' پر بخوبی قلم اُٹھا سکتی ہے۔

کل 62 صفحات کے پھیلاؤ پر اس شمارہ میں اداریہ کے بعد بارہ شہ سرخیاں قائم کی گئی ہیں جن کے ذیل میں 17 بیانیے مندرج ہیں۔ ان کی مختصر سی روداد یوں رہے کہ ''چراغ راہ'' (ص 5 اور 6) میں مصنفین کے علاوہ دانشوروں سے مخاطبت دراصل ایک روشن قندیل ہے جس کی شعاعیں چار دانگِ عالم کو روشن کر رہی ہیں۔ ''شخصیت'' (ص 7 تا ص 12) میں بانو طاہرہ سعید کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے جو ایک ایرانی خاتون تھیں اس لیے واپس ایران چلی گئیں، پر اُردو سے جُڑی رہیں۔ ''نکہت سخن'' (ص 13) میں شاعرات کے منتخب اشعار دیئے گئے ہیں جو اپنی اپنی مہک رکھتے ہیں۔ پر سیما نظمی کے اشعار پر بار بار نظر ٹھہرتی ہے۔ ''جہانِ نسواں'' (ص 14 تا ص 40) میں چھ قابل قدر مقالے درج ہیں۔ ''درسیات اور قومی تعلیمی پالیسی 2020ء'' میں آپ کو قومی پالیسی کے مقاصد، نصاب اور پالیسی کا ربط، تدریس کی تنظیم نو، تنقیدی سوچ کے لیے مواد میں تخفیف جیسے نکات سے واقفیت ہوگی۔ ''شناخت'' (ص 41 تا ص 44) میں عطیہ بی کی کہانیوں پر خوشگوار تبصرہ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ''کہانیاں'' (ص 45 تا ص 52) میں تین دلچسپ کہانیاں دی گئی ہیں لیکن ''خراٹے'' کا عنوان ہی توجہ کھینچ لیتا ہے۔ ''حسنِ سخن'' (ص 53 اور ص 54) میں تین سادہ سی غزلیں رکھ دی گئی ہیں۔ باقی کیا رہا۔ ''باورچی خانہ'' (ص 55 اور 56) میں ملذ ذ غذاؤں کی تیاری کے طریقے دیئے گئے ہیں۔ کیا خیال ہے؟ ''صحت'' (ص 57 اور 58) کے ذیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن حالات میں رحم کی رسولی کا مرض لاحق ہوسکتا ہے اور کہ حفظ ماتقدم کے بطور کیا کیا جتن اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ ''آرائش و زیبائش'' (ص 59 اور 60) کے تحت حسن کی نگہداشت کے طریقے درج ہیں۔ آزما کر دیکھا جاسکتا ہے۔ صفحات 61 اور 62 پر بالترتیب ''تاثرات'' اور ''خواتین خبرنامہ'' دیئے گئے ہیں۔ ان معلومات سے خاطر خواہ فیض اُٹھایا جاسکتا ہے۔ خرید کر پڑھنا لازم ہے۔

مصطفی ندیم خان غوری، زرّین ولا، بی-۱۱، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، (مہاراشٹرا)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

تیسری اشاعت: 2021

صفحات: 533

قیمت 240 روپے

آئینہ جہاں (کلیاتِ قرۃ العین حیدر) جلد دوم

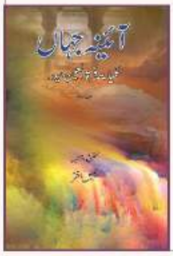

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 559

قیمت: 275 روپے

آئینہ جہاں (کلیاتِ قرۃ العین حیدر) جلد سوم

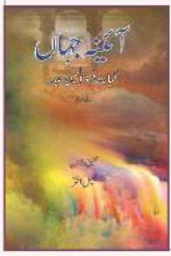

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 477

قیمت: 245 روپے

اردو شاعری میں قومیت کا تصور

مصنف: مغیث الدین فریدی

ترتیب و تقدیم: شیخ عقیل احمد

سنہ اشاعت: 2021

صفحات: 234، قیمت 135 روپے

مسلم حکومت کے دوران ہندوستان میں علم کا فروغ

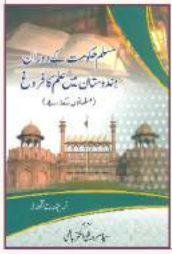

مصنف: نریندر ناتھ لا

مترجم: سید مسرور علی اختر ہاشمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 177، قیمت: 110 روپے

اردو کیسے لکھیں؟

مصنف: گوپی چند نارنگ

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 104

قیمت: 58 روپے

پریم چند

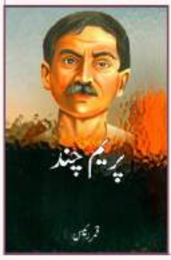

مصنف: قمر رئیس

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 53

قیمت: 40 روپے

اردو صحافت (1858 سے 1900 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: فاروق ارگلی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 191

قیمت: 110 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अक्तूबर-२०२१ वर्ष: ५, अंक: १०

Mahnama Khawateen Duniya Monthly October 2021, Vol. 5 , Issue:10

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-10-2021
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6